غالب اور سرزمینِ ہریانہ

(تحقیقی مقالات)

مرتبہ

کشمیری لال ذاکر

Scanned with CamScanner

غالب اور سرزمینِ ہریانہ

تحقیقی مقالات

مرتبہ

کشمیری لال ذاکر

ہریانہ اُردو اکادمی، ۵۱۶، سیکٹر ۱۲، پنچکولہ (ہریانہ)

نام کتاب ——— غالب اور سرزمینِ ہریانہ
مرتبہ ——— کشمیری لال ذاکر
معاون ——— شمس تبریزی
پروجیکٹ آفیسر ——— ڈاکٹر محمد ایوب خاں
ریسرچ اسسٹنٹ ——— شہزاد علی
کتابت ——— سید عبدالحنان، محمد یامین قاسمی
تعداد ——— پانچ سو
اشاعت ——— سنہ ۲۰۰۰ء
قیمت ——— ۵۶ روپے

کشمیری لال ذاکر، سکریٹری ہریانہ اُردو اکادمی نے ریشماں پرنٹرس چنڈی گڑھ سے چھپوا کر دفتر ہریانہ اُردو اکادمی ۵۱۶ سیکٹر ۱۲ سے شائع کیا۔

فہرست

۱۔ اظہارِ تہنیت ـــــ عزت مآب مہابیر پرساد جی، گورنر ہریانہ

۲۔ دُعائیہ ـــــ عالی جناب اوم پرکاش چوٹالہ، وزیرِ اعلا ہریانہ، صدر ہریانہ اُردو اکادمی

۳۔ حرفِ چند ـــــ جناب وشنو بھگوان، آئی اے ایس، پرنسپل سکریٹری وزیرِ اعلا ہریانہ

۴۔ ابتدائیہ ـــــ جناب پریم پرشانت، آئی اے ایس، نائب صدر ہریانہ اُردو اکادمی

۵۔ پیش لفظ ـــــ کشمیری لال ذاکر

۶۔ ہریانہ کی تاریخ و تہذیب ـــــ شہزاد علی ۱۵

۷۔ اُردو اور ہریانوی کا باہمی رشتہ ـــــ ڈاکٹر راجندر سروپ وتس ۲۶

۸۔ غالب کے اجداد ـــــ کمال احمد صدیقی ۵۳

۹۔ غالب اور نوابانِ لوہارو ـــــ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۶۸

۱۰۔ خاندانِ لوہارو اور ریاستِ فیروز پور جھرکا۔ ڈاکٹر محمد ایوب خان ۸۲

۱۱۔ مرزا غالب کی پنشن کا مقدمہ ـــــ پروفیسر نثار احمد فاروقی ۱۰۷

۱۲۔ مرزا غالب کی پنشن کا مقدمہ و دیگر امور ـــــ مخمور سعیدی ۱۳۵

۱۳۔ غالب اور ان کے چند معاصرین ـــــ شاہد ماہلی ۱۵۰

۱۴۔ غالب اور قتیل ـــــ ڈاکٹر خلیق انجم ۱۷۷

۱۵۔ مرزا غالب کے ہریانوی شاگرد و خاندانِ لوہارو کے شاعر ڈاکٹر فرزانہ نسیم ۲۰۹

۱۶۔ حرفِ آخر ـــــ کشمیری لال ذاکر ۲۳۶

مشاورتی کمیٹی برائے کتاب "غالب اور سرزمینِ ہریانہ"

۱۔ ڈاکٹر سیدہ سیدین، نئی دہلی
۲۔ ڈاکٹر صغرا مہدی، نئی دہلی
۳۔ ڈاکٹر خلیق انجم، نئی دہلی
۴۔ پروفیسر تنویر احمد علوی، نئی دہلی
۵۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، لکھنؤ
۶۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جموں
۷۔ جناب شاہد ماہلی، نئی دہلی
۸۔ جناب مخمور سعیدی، نئی دہلی
۹۔ کشمیری لال ذاکر، سکریٹری ہریانہ اردو اکادمی

اظہارِ تہنیت

دُنیا کی مختلف زبانوں کے اَدب کی اہم اور نمایاں شخصیات کی اگر فہرست ترتیب دی جائے تو غالبؔ کا نام اُن میں سرِ فہرست ہوگا۔ غالبؔ اُردو کے اُن شاعروں میں تھے جنہوں نے اَدب کو نئی سمتوں سے رُوشناس کرایا اور اَدبی شعر و نثر کی قوّت کا بھرپُور احساس دِلایا۔ غالبؔ اگر ایک طرف اپنی شاعری کے نقطۂ عروج پر ہیں تو دُوسری جانب اپنی خطُوط نگاری کے تعلق سے اُردو نثر کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔ یہ ہمارے مُلک کی خوش قسمتی ہے کہ غالبؔ نے ہندوستان میں جنم لیا اور اس عظیم مُلک کو غالبؔ کا ملک ہونے کا شرف حاصل ہُوا۔ یہاں کی مٹی اس قدر زرخیز ہے کہ چانکیہ، کالیداس، والمیک، تُلسی و کبیر جیسی شخصیات یہاں پیدا ہُوئیں، جنہوں نے اپنے عظیم کارناموں سے ہندوستان کا نام دُنیا بھر میں روشن کیا۔ غالبؔ بھی اِن ہی میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنی شاعری سے ہندوستان کو عالمگیر شہرت عطا کی۔ شاید اقبالؔ نے ایسے ہی لوگوں کے لئے کہا تھا ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نُوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے غالبؔ کی اَدبی خدمات پر ایک ایسی دستاویزی کتاب شائع کی جارہی ہے، جس میں غالبؔ اور ہریانہ کے رِشتے کو واضح کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس تعلق سے ابتک اُردو میں کوئی کتاب نہیں ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف یہ پتہ چلے گا کہ غالبؔ اور ہریانہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہریانہ صرف ایک زراعتی صوبہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی ادبی حیثیت بھی ہے اور غالبؔ جیسی ادبی شخصیت بھی اس سے وابستہ رہی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ "غالبؔ اور سرزمین ہریانہ" عُنوان کے تحت یہ کتاب ایک علاحدہ نوعیت کی ہوگی اور اس سے تحقیق کے نئے راستے کھُلیں گے۔ میں اس کام کے لئے ہریانہ اُردو اکادمی کو مبارکباد دیتا ہوں، جس نے اتنے اہم موضوع پر ایک پروجیکٹ کی شکل میں کام کیا اور اسے دستاویزی حیثیت دی۔

مہابیر پرساد

(مہابیر پرساد)
گورنر ہریانہ

دُعائیہ

غالب کی شاعرانہ عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اُن کا شمار ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ دُنیا کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ یہ امر باعثِ مسرت و افتخار ہے کہ دُنیا کے اس عظیم شاعر کا سرزمین ہریانہ سے بھی گہرا تعلق رہا ہے۔ غالب کی شادی نواب فیروز پور جھرکہ نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی تھی۔ اور انہیں ریاست فیروز پور جھرکہ اور لوہارو سے کافی عرصہ تک پنشن بھی ملتی رہی۔ یہ دونوں ریاستیں ہریانہ کا ہی حصہ ہیں۔ ہریانہ کی معروف ادبی شخصیت خواجہ الطاف حسین حالی کو غالب کی شاگردی کا شرف حاصل رہا جس کا حق انہوں نے 'یادگارِ غالب' جیسی کتاب لکھ کر ادا کیا۔ جو اردو تنقید و تحقیق میں نقشِ اوّل تصوّر کی جاتی ہے۔

غالب اُردو ادب کی ایک ایسی عظیم شخصیت ہیں جن کی ادبی خدمات پر سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں تحریر کی جا چکی ہیں پھر بھی غالب ہیں کہ اُن کے کلام کی تہیں کھلتی ہی جا رہی ہیں۔ بقول غالب ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے ــــ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

بے حد خوشی کی بات ہے کہ اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے اس کام کو ایک پروجکٹ کی شکل میں انجام دیا اور مقررہ وقت میں مکمل کر کے غالب اور ہریانہ کے رشتے کو تقویت بخشی۔

مجھے یقین ہے کہ ہریانہ اُردو اکادمی کی اس کوشش کو اُردو دُنیا میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اور غالب کے سرزمین ہریانہ سے رشتے کو نہ صرف تقویت ملے گی بلکہ تحقیق کے طالب علموں کے لئے نئی راہیں منوّر ہوں گی۔

(اوم پرکاش چوٹالہ)
وزیرِ اعلا، ہریانہ

حرفِ چند

یہ بات اب واضح طور پر عیاں ہو گئی ہے کہ اُردو ہریانہ میں ہی جنمی اور یہیں پروان چڑھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے پہلے نقاد خواجہ الطاف حُسین حالیؔ، اُردو کے پہلے طنزیہ و مزاحیہ شاعر میر جعفر زٹلی، اُردو کے پہلے لغت نویس مولوی عبدالکریم، اُردو کے پہلے ناول نگار منشی گمُانی لعل اور اُردو کے پہلے پروفیسر مولانا وحیدالدین سلیم کا تعلق ہریانہ سے ہی تھا۔ علاوہ ازیں خواجہ احمد عباس، صالحہ عابد حسین، آفتابؔ پانی پتی، مطلبیؔ فریدآبادی ہریانہ میں جدید اُردو ادب کے معمار و بانی تصوّر کئے جاتے ہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ اب سے کچھ عرصہ قبل ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے غالبؔ صدی تقریبات کے موقع پر انڈو پاک سیمینار کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں غالبؔ کی شعری اور ادبی خدمات پر مختلف موضوعات کے تحت مقالات پڑھے گئے تھے۔ اس سیمینار میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ غالبؔ کے چونکہ فیروز پور جھرکا اور لوہارو سے گہرے تعلقات تھے اس لئے ضروری ہے کہ ایک پروجیکٹ کی صورت میں ان کے ان ریاستوں سے تعلقات پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اور غالبؔ و ہریانہ کے رشتے پر کام کیا جائے۔

میرے لئے یہ بہت ہی فخر کی بات ہے کہ میں اس وقت اکادمی کا نائب صدر تھا اور اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکرؔ نے خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے اس پروجیکٹ کو میرے سامنے رکھا، جسے میں نے فوری طور پر منظور کر دیا۔ آج جب یہ تحقیقی کام کتاب کی شکل میں میرے سامنے ہے تو میں بہت مسرت محسوس کر رہا ہوں۔

مجھے اُمید ہے کہ ادبی دنیا میں یہ کتاب غالبؔ اور ہریانہ کے رشتے کو واضح کرے گی اور ایک دستاویزی کتاب تصور کی جائے گی جس سے ادب کے طالب علم ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں گے۔ میں اس خصوصی کام کے لئے اراکینِ اکادمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

وشنو بھگوان

(وشنو بھگوان، آئی اے ایس)

پرنسپل سکریٹری، وزیرِ اعلا، ہریانہ

ابتدائیہ

یہ امر قابلِ فخر ہے کہ ہریانہ اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام غالب کے ہریانہ سے رِشتے کو مستحکم اور مضبوط بنانے کے مقصد کے تحت " غالب اور سرزمینِ ہریانہ " کے عنوان سے کتاب اِشاعت پذیر ہو رہی ہے، جو یقیناً اُردو اَدب میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے۔

غالب کی عظمت محض ہندوستان تک ہی محدُود نہیں ہے، بلکہ اس کا اِعتراف پُوری دُنیا میں کیا جا چکا ہے۔ اُن کے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کے خیالات و افکار وقت کے ساتھ اپنی معنویت سے محرُوم نہیں ہُوئے، بلکہ اُن کے معنیٰ مزید کھُل کر انسانی سوچ اور فکر کو وُسعت عطا کر رہے ہیں۔ اُن کا فلسفیانہ اندازِ بیان آج بھی ان کی شاعرانہ عظمت کی پہچان ہے۔

بقول غالب ؎

ہُوئی مدّت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے

وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یُوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

غالب ایک روشن دماغ انسان تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں، ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کے خطوط اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ اُنھوں نے خط لکھنے کی ایک نئی طرز ڈالی جس میں انہوں نے مُراسلے کو مکالمہ بنا کر پیش کیا۔ ان کے بہت سے خطوں میں ہریانہ کے تعلق سے بھی واضح اِشارے موجُود ہیں۔ اِسی کے پیشِ نظر محسوس کیا گیا کہ ہریانہ اُردو اکادمی اس کام کی تکمیل کے لئے ایک پروجیکٹ بنا کر اسے جلد پُورا کرے۔ مجھے خوشی ہے کہ اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لئے اُردو کے بہت سے اسکالروں کو شامل کیا اور اسے مکمل کرنے میں ان کا بھرپُور تعاون حاصل کیا۔ "غالب اور سرزمینِ ہریانہ" ایک ایسا تحقیقی کام ہے جو مستقبل میں نہ صِرف اَدب کی نئی راہیں کھولے گا، بلکہ اَدب کے اُفق پر ہریانہ اور غالب کے رشتے کو بھی اُستوار کرے گا، اور غالب کی فیروز پُور جھِرکا اور لوہارو سے مِلنے والی پنشن کے سِلسلے میں بھی تفصیل سے روشنی ڈالے گا۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اَدبی حلقوں میں مقصدیت اور اہمیت کے اعتبار سے قدر کی نِگاہ سے دیکھی جائے گی۔

پریم پرشانت

(پریم پرشانت، آئی اے ایس)

کمشنر مالیات و سکریٹری تعلیمات، ہریانہ

و نائب صدر، ہریانہ اُردو اکادمی

پیش لفظ

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی عظمت سے کون انحراف کر سکتا ہے۔ اُن کا شمار ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے عظیم شعراء میں ہوتا ہے۔ انہیں اس دُنیا سے رخصت ہوئے تقریباً ڈیڑھ صدی کا عرصہ گذر چکا ہے۔ لیکن اُن کے افکار و خیالات آج بھی ان ہی قدر و منزلت کے حامل ہیں جوان کے زمانے میں تھے غلط نہیں ہوگا اگر کہا جائے کہ وہ اپنے عہد کی فکر کے اعتبار سے صدیوں آگے تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے دور کے نکتہ چینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جو کچھ بھی کہا برملا کہا ان کا خیال تھا کہ ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مُدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

غالبؔ ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو اکبر آباد میں پیدا ہوئے جسے اب آگرہ کہتے ہیں، جب وہ پانچ برس کے ہی تھے تو اُن کے والد کا انتقال ہوگیا۔ پھر اُن کی پرورش اُن کے چچا نصر اللہ خاں بیگ نے کی۔ غالبؔ ابھی ۹ برس کے ہی ہوئے تھے کہ اُن کے چچا بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ابھی ۱۳ کے سن کو ہی پہنچے تھے کہ غالبؔ کی شادی ہوگئی۔ یہ تمام واقعات اتنی جلدی جلدی رُونما ہوئے کہ غالبؔ کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اپنی عمر کے آخری پڑاؤ تک اولاد کے نہ ہونے کا غم رہا۔ جو بچے ہوئے وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ عارفؔ کو گود لیا وہ بھی عالمِ جوانی میں

غالب کو داغِ مفارقت دے گئے۔ انہیں سکون کے لمحات بہت کم میسّر آئے ہمیشہ مشکلات میں ہی مبتلا رہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ زندگی کی پیچیدگیوں نے غالب کو ایک ایسا شاعر بنا دیا۔ جس کے یہاں ذاتی تجربات و مشاہدات ہیں۔

غالب ایک عظیم شاعر ہی نہیں بلکہ ایک دُور اندیش انسان اور ایک مُفکّر بھی تھے۔ اُن کی بصیرت میں گہرائی و گیرائی تھی۔ اُن کے اندر قطرے میں دجلہ دیکھنے کی صلاحیت تھی۔ اُن کا اُردو کلام ہو یا فارسی کلام دونوں کی معنی آفرینی جدّتِ ادا اور بلاغت انہیں ان کے معاصرین سے ممیّز و ممتاز کرتی ہے۔ اُن کے کلام کی سلاست ایسی ہے کہ اس کی مثال پیدا کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
ہم ہیں مُشتاق اور وہ بیزار
یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

یا اس غزل کے اشعار

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھّا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا، گلہ نہ ہوا

یا یہ کہ ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

یہ یا ایسے ان گنت اشعار ہیں جو غالب کی شاعری کو انفرادیت عطا کرتے ہیں اور اُن کی علاحدہ شناخت قائم کرتے ہیں۔

جہاں تک غالب کی نثر کا تعلق ہے انہوں نے اُسے نہ صرف سادہ و سلیس بنایا بلکہ اپنے خطوط کے توسط سے مراسلے کو مکالمے میں بدل کر ایک نیا لطف پیدا کیا۔ انہوں نے اپنے خطوں کی زبان کے ذریعہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ میں دوری کے احساس کو ختم کر دیا۔ غالب کی خطوط نگاری میں اس جدت کو اہلِ زبان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ غالب کی شاعری اور ان کے خطوط ایک عظیم اور بیدار شخصیت کے ترجمان ہیں۔ بقول آل احمد سرور "شاعری میں غالب کی فکر کا وہ اُرس نظر آتا ہے جو آنسوئے افلاک تک جا سکتی ہے۔ غالب کے خطوط میں وہ آدمی نظر آتا ہے جو اس فکر کی وجہ سے تنہائی محسوس کرتا ہے اور اس تنہائی کو دُور کرنے کے لئے اپنے گرد ایک انجمن بنالیتا ہے۔"

عظیم شخصیتوں پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی تاہم ان کا کسی سے تھوڑا بہت تعلق ہو تو اس پر فخر کیے جاتے ہیں۔

غالب آگرہ میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تمام عمر دہلی میں گذری۔ ریاست ہریانہ کو اس بات پر فخر ہے کہ غالب کا اس سرزمین سے گہرا رشتہ تھا۔ ان کی شادی نواب فیروز پور جھرکہ کی بھتیجی امراؤ بیگم سے ہوئی تھی اور ان کو فیروز پور جھرکہ اور لوہارو سے طویل عرصے تک پنشن بھی ملتی رہی تھی یہ دونوں ریاستیں اس وقت ہریانہ کا حصہ تھیں اور اب بھی ہیں۔ خاندانِ لوہارو کے متعدد

شعراء غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ اس طرح غالب کا ہریانہ کی متذکرہ دونوں ریاستوں سے نہ صرف رشتہ ہی تھا بلکہ حکومتی اور ادبی سطح پر بھی گہرے تعلقات تھے۔ ان ہی تعلقات کو عوامی سطح پر سامنے لانے کے لئے اکادمی کی جانب سے جب اپریل ۱۹۹۸ء میں غالب کی دو سو سالہ تقریبات کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک و بیرون ملک کے مشاہیر نے شرکت کی۔ تو اس میں یہ بات واضح طور پر سامنے آئی کہ غالب کے ہریانہ سے رشتہ پر "غالب اور سرزمین ہریانہ" عنوان کے تحت ایک پروجکٹ تیار کیا جائے جس میں مختلف موضوعات پر مضامین تحریر کرائے جائیں اور اہلِ قلم حضرات کے تعاون سے اس پروجکٹ کو تحقیقی شکل دی جائے۔

بے حد مسرت کی بات ہے کہ زیرِ نظر کتاب اسی پروجکٹ کا حصہ ہے۔ جسے گورنر ہریانہ عالی جناب مہابیر پرساد اور وزیرِ اعلا ہریانہ عزت مآب چودھری ادم پرکاش چوٹالہ کی سرپرستی حاصل رہی ہے جس کے بغیر یہ کام ناممکن تھا۔ ہم ہندوستان کے ان معروف قلم کاروں کے ممنون ہیں جنہوں نے کتاب کی تیاری میں اپنا بھرپور تعاون دیا اور مقررہ عنوانات کے تحت مقالے تحریر کر کے کتاب کو اہمیت بخشی۔ کتاب میں مختلف موضوعات پر دس مضامین شامل ہیں جس میں تقریباً تمام ہی مضامین غالب اور ہریانہ کے رشتے کو واضح کرتے ہیں۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ کیونکہ ماہرین غالبیات اور اردو ادب کے قارئین نے غالب کو کبھی اس نقطۂ نظر سے نہیں پڑھا ہوگا جس سے یہ عیاں ہو سکتا ہے کہ غالب اور ہریانہ ایک دوسرے سے کس قدر نزدیک ہیں۔

بے حد خوشی کی بات ہے کہ ان رشتوں کو سمجھنے کے لئے جس شاعر نے پہل کی ان کا تعلق بھی پانی پت سے تھا جنہیں ہم حالی پانی پتی کے نام سے جانتے ہیں اور جو غالب کے عزیز ترین شاگرد تصور کئے جاتے ہیں۔ عموماً غالب کو ایک شاعر تصور کر کے ان کی شعری عظمت کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ زندگی

کے مختلف مراحل میں اُن کے متعدد نوابوں، راجاؤں اور سرکردہ شخصیتوں سے ادب کے ساتھ ساتھ سماجی اور اقتصادی رشتے بھی تھے۔ اس لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ غالب کو ان کی شاعری سے تھوڑا سا جدا کر کے ان کی سماجی حیثیت کو سامنے لایا جائے۔ یہ کتاب اسی خیال کے پیش نظر ترتیب دی گئی ہے جس کا صرف اور صرف مقصد یہی ہے کہ غالب اور ہریانہ کے رشتے کو واضح کیا جائے۔

ہم اس پروجیکٹ کی تکمیل میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں یہ تو آپ کتاب پڑھکر ہی اندازہ لگائیں گے البتہ ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اکادمی کے توسط سے یہ ایک ایسا تحقیقی کام انجام پذیر ہوا ہے جس کی آنے والے وقت میں اہمیت برقرار رہے گی اور ادب کے طالب علموں کے لئے غالب سے متعلق تحقیق کے نئے در وا ہوں گے۔

ہم اس کتاب کی تکمیل کے لئے ان تمام حضرات کے دل سے ممنون ہیں جن کے مفید مشوروں سے وقتاً فوقتاً مستفیض ہوتے رہے ہیں۔ یقین ہے کہ ہماری یہ کوشش ادبی حلقوں میں کامیاب تصور کی جائے گی اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

کشمیری لال ذاکر

ہریانہ کی تاریخ و تہذیب

ہندوستان مختلف زبانوں اور مختلف تہذیبی ریاستوں پر مشتمل ایک وسیع و عریض ملک ہے۔ ان ریاستوں میں ہریانہ بھی ایک چھوٹا سا صوبہ ہے جو ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہے۔ یہ مشرق میں اتر پردیش سے، مغرب میں پنجاب سے، شمال میں شوالک پہاڑیوں اور ہماچل پردیش سے اور جنوب میں اراولی پہاڑیوں اور راجستھان کے ریگستانی علاقے سے گھرا ہوا ہے۔ ۹ اضلاع کا یہ صوبہ ہریانہ آج سے تقریباً ۳۳ سال پہلے یکم نومبر ۱۹۶۶ء کو وجود میں آیا تھا پہلے یہ صوبہ متحدہ پنجاب کا ایک حصہ تھا۔ ہریانہ کی تاریخ و تہذیب بہت قدیم ہے اور یہاں پھلی پھولی اور پروان چڑھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے ادب نے اسے ہندوستانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ کہا ہے۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ ہریانہ کا نام ہریانہ کیسے پڑا؟ اس کے بارے میں کوئی ٹھوس شواہد نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی بعض روایتوں کے تحت لوگ ہرِ یعنی بھگوان کرشن سے اس کا تعلق بتاتے ہیں۔ کچھ اسے "ہر" یعنی شنکر جی سے اور کچھ عالموں کا خیال ہے کہ اس کا نام راجہ "ہریش چندر" کے نام سے پڑا ہے۔ تاہم نام کے بارے میں بہت زیادہ تفصیل سے ہمارے پاس معلومات نہیں ہیں۔ پھر بھی مانا جاتا ہے کہ "ہریانہ" نام اس پردیش کی ہریالی کی وجہ پڑا کیونکہ جب کبھی یہاں بارش ہوتی ہے تو کچھ ہی دنوں میں اس کی ساری زمین مختلف نباتاتی جڑی بوٹیوں سے بھر جاتی ہے اور سارا علاقہ ہری چادر سے ڈھک جاتا ہے۔

رقبہ کے لحاظ سے ہریانہ قدرتی طور پر تین حصّوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کے ایک طرف شوالک پہاڑیاں گھگھر دوسرا یمنا ندی کے درمیان کا حصّہ اور تیسرا اراولی پہاڑیوں کا خشک میدانی علاقہ ہے۔ شوالک پہاڑیوں کا حصّہ انبالہ ضلع کے جنوبی حصہ کی طرف واقع ہے۔ اس میں کئی برساتی ندیاں جیسے گھگھر مارکنڈا اور چیتنگ وغیرہ بہتی ہیں جو بارش کے دنوں میں اوپری ڈھلانوں سے اپنے ساتھ ریت بجری اور پتھر بہا کر لاتی ہیں۔ جو میدانی علاقوں میں لوگوں کے بہت کام آتا ہے۔ اس علاقے میں بہت ہی خوبصورت وادیاں ہیں جس میں کالکا اور پنجور کی وادی قابلِ ذکر ہے۔ ہریانہ میں خوبصورت پہاڑی مقام بھی ہے جس کا نام "موری" ہے۔

دوسرا حصّہ گھگھر ندی اور یمنا ندی کے درمیان کا ہے جو کہ بہت ہی زیادہ زرخیز ہے۔ یمنا ندی ہی ہریانہ اور اترپردیش میں ایک سرحد کا کام کرتی ہے۔ یہ ندی قدرتی طور پر ہریانہ اور اترپردیش کو ایک دوسرے سے الگ کر دیتی ہے۔ ان دونوں ندیوں کے درمیان بہت سے صنعتی مراکز قائم ہیں اور اس طرح یہ ہریانہ کا سب سے زیادہ خوشحال علاقہ مانا جاتا ہے۔ اس میں جو شہر آباد ہیں۔ ان میں انبالہ، کوروکشیتر، کرنال، پانی پت اور سونی پت قابلِ ذکر ہیں۔ یہ علاقہ صنعتی اعتبار سے ہندوستان کے اہم علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تیسرے حصّے میں اراولی پہاڑیوں کی شاخیں ہیں۔ ان کے میدانی حصّہ میں گوڑ گاؤں، فریدآباد، ریواڑی، مہندرگڑھ اور بھوانی ضلع آباد ہیں۔ ریواڑی اور مہندرگڑھ ضلع راجستھان کے ریگستانی علاقہ سے ملتے ہیں۔ یہاں کئی جگہوں پر مختلف اونچائی والے بڑے ریتیلے ٹیلے ہیں۔

ہریانہ کا موسم اور اس کی آب و ہوا شمال ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے جیسی ہے۔ یہاں گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں کافی سردی پڑتی ہے۔ یہاں بارش کم اور بے موسمی ہوتی ہے۔ جنوبی حصّہ میں بارش کم ہونے کی

وجہ سے کئی بار قحط جیسی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

ہریانہ کے بسنے والے زیادہ آبادی میں ہندو ہیں۔ اس کے بعد سکھ پھر مسلمان اور ان کے بعد جینی عیسائی اور بودھ مذہب کے ماننے والوں کا نمبر آتا ہے۔ ہندو مذہب میں برہمنوں کو سب سے اونچی ذات کا مانا جاتا ہے۔ ان کا کام مذہبی ہے لیکن اب برہمن کھیتی باڑی اور سرکاری عہدوں پر بھی فائز ہیں۔

اس کے بعد کھیتی باڑی کرنے والے جاٹ سب سے زیادہ اہم مقام رکھتے ہیں۔ یہ لوگ جسمانی اعتبار سے توانائی اور بہت لمبے قد بھورے رنگ کالی آنکھیں اور لمبی ناک والے ہوتے ہیں۔ اور بہت اچھے کسان ہیں۔ ہندوستانی فوج اور پولس میں جاٹوں کی اچھی تعداد ہے۔ جاٹوں کی طرح اہیر بھی ہریانہ میں ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔

جاٹوں اہیروں اور گوجروں کے بعد ہریانہ میں راجپوت بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ جنہوں نے اپنی بہادری کے جوہر چین اور پاکستان کے ساتھ ہوئی جنگوں میں دکھائے ہیں۔ وجے آپریشن کے دوران بھی یہاں کے جوانوں نے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے بھی شہادت دینے سے گریز نہیں کیا۔ روڑ اور سینی ذات کے لوگ بھی ہریانہ میں بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ یہ لوگ تجارت اور کھیتی باڑی کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں نے ہریانہ کی ترقی میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔

بعد ازاں ہریانہ میں مسلمانوں کا نمبر آتا ہے۔ آزادی سے پہلے یہاں مختلف ذاتوں کے مسلمان آباد تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ان میں زیادہ تر مسلمان پاکستان ہجرت کر گئے فی الوقت ہریانہ میں میو، پٹھان، لوہار، رنگریز وغیرہ ہی بستے ہیں۔ ہریانہ میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تر گوڑ گاؤں فریدآباد اور یمنا نگر کے علاقوں میں ہی ہے۔ یہ قوم بھی اپنی شجاعت کے لیے مشہور ہے۔ ان کی زمینیں زرخیز ہیں لیکن سینچائی کے اچھے ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے کھیتی باڑی میں کچھ زیادہ

اہم مقام نہیں بنا سکے۔ مزید برآں تعلیمی میدان میں بھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

جب ہم ہریانہ کے سیاسی منظرنامے پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہریانہ کی تاریخ کافی قدیم ہے کسی زمانے میں اس پردیش پر 'کورو' نام کا راجہ راج کرتا تھا[۱] جو بہت طاقتور اور دور اندیش تھا۔ سیاسی طور پر بھی وہ بہت سلجھا ہوا تھا۔ اسی کے نام سے اس صوبے کے ایک شہر کا نام 'کوروکشیتر' پڑا۔ اس سرزمین پر بھگوان 'کرشن' کے روپ میں اوتار لے کر آئے۔ اسی سرزمین پر شری کرشن نے ارجن کو نصیحت دی تھی جس کو آج "گیتا سندیش" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ زمانہ "مہا بھارت کال" کے نام سے مشہور ہوا۔

"مہا بھارت" کے زمانے تک لوگ بہت خوشحال رہے۔ اُس کے بعد یہاں سیاسی افراتفری کا دور دورہ ہوا۔ ۳۲۳ قبل مسیح میں یہاں پر چندر گپت موریہ کا زمانہ شروع ہوا جس نے اپنی حکومت کو بہت وسیع کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے "بندوسار" اور پوتے اشوک کا زمانہ شروع ہوا[۲]۔ اشوک تک یہاں کے لوگ بہت خوشحال رہے۔ اشوک کے بعد اُس کے جانشینوں کے آپسی جھگڑوں سے یہ علاقہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ گیا۔

چوتھی صدی میں ۳۵۰ء سے ۳۷۵ء تک ہریانہ کو گپت حکمرانوں کی حکومت کا ایک حصہ بنا دیا گیا۔ جو ان کے قبضہ میں چھٹی صدی عیسوی تک رہا۔

اس کے بعد اس پردیش پر ہرش وردھن کا زمانہ آیا جو بہت دلیر اور عالیشان بادشاہ تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو وسیع کیا اور بہت فتوحات حاصل کیں۔ اس کی حکمرانی اور فتوحات کا سلسلہ ۶۰۶ء میں شروع ہوا۔ اس کی سلطنت جنوب میں ہمالیہ سے لے کر نرمدا ندی تک اور مشرق میں پنجاب اور بحرِ عرب تک پھیلی

ص۱ ہریانہ کا اتہاس (ایک سروکیشن (بودھ پرکاش) ص۳

ص۲ ہریانہ اتہاسک سینہاولوکن کے سی یادو اور ایس۔ آر۔ فوگاٹ ص۱۶

ہوئی تھی جس میں آج کا بنگال، بہار، مالوہ، قنوج، ہریانہ، پنجاب، سندھ، کشمیر اور نیپال شامل تھے۔ ۶۴۷ء میں اُس کی موت ہو گئی۔ اس کے جانشینوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس وسیع و عریض سلطنت کو سنبھال سکتا۔ نتیجے میں یہاں بدامنی پھیل گئی اور مختلف علاقوں کے حکمرانوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اس زمانے میں کشمیر کے راجہ للیتا دتیہ نے یشوور دھن کو ہرا کر ہریانہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا لیکن یہ بھی زیادہ دیر تک اس پر حکمرانی نہ کر سکے۔ اسی دوران ایک طاقتور حکمران "تومر" آیا اور اس نے ۷۳۶ء میں دلی کو اپنی راجدھانی بنا لیا اور مسلمانوں کے حملوں تک وہ دلی پر راج کرتا رہا۔

مسلمان حملہ آوروں میں سب سے پہلے محمود غزنوی نے ہریانہ پر حملہ کیا ۱۰۰۹ء سے لے کر ۱۰۱۴ء تک محمود غزنوی اور اس کے جانشینوں نے ہریانہ پر حملہ کئے۔ اسی کا فائدہ اٹھا کر اجمیر کے چوہان راجاؤں نے بھی ہریانہ پر حملے کئے اور اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ یہ حالات ۱۲ویں صدی تک قائم رہے۔ لیکن ۹۲-۱۱۹۱ء میں شہاب الدین غوری کے حملے نے سیاسی حالات کو بدل کر رکھ دیا۔ ہندوستان کے بادشاہ پرتھوی راج چوہان اور ہریانہ کے لوگوں نے اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا اور ہندوستان جس میں ہریانہ شامل تھا مسلمان حکمرانوں کے قبضہ میں آگیا۔ شہاب الدین غوری کی وفات کے بعد دلی پر غلام خاندان کی حکمرانی ہو گئی۔ جس میں قطب الدین ایبک کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۲۰۶ء سے ۱۲۶۰ء تک خاندانِ غلاماں اور اس کے بعد خلجیوں کی حکمرانی کو ہریانہ کے عوام نے خاص کر میوات علاقہ کے لوگوں نے ذہنی اور جسمانی تکلیفوں کے ساتھ برداشت کیا۔

اس کے بعد تغلقوں کا دور آیا۔ خاص کر فیروز تغلق نے ہریانہ کے اس حصہ

ص۱ ہریانہ اتہاسک سنیہاولوکن (کے۔سی۔یادو۔ ایس۔آر۔ فوگارٹ) ص۱۸

کو جہاں پر آج حصار شہر ہے، بسایا اس کا حصار فیروز نام رکھا۔ اس نے اس علاقہ کی طرف دھیان دیتے ہوئے قلعہ اور محل بنوائے۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے باغ لگوائے جن کو نہروں کے ذریعہ سیراب کیا جاتا تھا۔ اس طرح اس نے اس علاقہ کو ایک نئی پہچان دی۔ یہی وہ شہر تھا جو باہر سے آنے والے تاجروں کے راستے میں پڑتا تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے نام سے ایک شہر فتح آباد بھی بسایا۔ فیروز تغلق نے سرسہ کے پاس ایک شہر اور بھی بسایا جس کو فیروز آباد ہرنی کھیڑا کا نام دیا گیا۔ اسی نے کھیتی باڑی کو زیادہ موثر ڈھنگ سے بنانے کے لئے نہروں کے جال بچھا دیئے تھے۔

اس کی موت کے بعد ۱۳۸۸ء میں فیروز تغلق کے بیٹوں میں خانہ جنگی چھڑ گئی اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تیمور ہندوستان میں حملہ آور ہوا اور ہریانہ میں کئی دن رکا۔ ہریانہ کے لوگوں نے اس کا سامنا بڑی بہادری سے کیا لیکن کامیابی نہ مل سکی تیمور کے واپس وطن لوٹ جانے کے بعد یہاں پھر بدامنی پھیل گئی اور موجودہ سرزمین ہریانہ کے لوگوں نے آزادی کا بگل بجا دیا۔ اس دوران صوبے میں کئی آزاد ریاستیں وجود میں آئیں۔

اس کے بعد ہریانہ پر لودھی خاندان کی حکمرانی رہی۔ ابراہیم لودھی اس خاندان کا آخری بادشاہ تھا جو کہ ۱۵۲۶ء میں مغل سردار بابر کے ساتھ پانی پت کی لڑائی میں (پانی پت کی پہلی لڑائی) ہارا اور اس طرح بابر ابراہیم لودھی کو ہرا کر دلی پر قابض ہو گیا اور اس طرح ہریانہ مغل سلطنت کے قبضہ میں آ گیا۔

بابر کی موت کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں گدی پر بیٹھا۔ ہمایوں کے وقت ایک بار پھر ملک میں بدامنی پھیل گئی جس کا فائدہ اٹھا کر شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو کھدیڑ دیا اور اس طرح ہریانہ بھی دوسرے علاقوں کے ساتھ شیر شاہ سوری کے زیر قبضہ ہو گیا۔ دوسری طرف ہمایوں نے دوبارہ ایران میں اپنی طاقت کو یکجا کیا اور ۱۵ سال بعد پھر ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ اس بار وہ زیادہ دیر تک حکومت

نہیں کر سکا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ ہمایوں کی موت کے وقت اس کا بیٹا اکبر ۱۳ برس کا تھا جس کو گدی پر بٹھا دیا گیا۔ بیرم خاں جو اکبر کا اتالیق تھا اکبر کے نام سے ملک کو چلاتا رہا۔

اکبر نے ہندوستان پر تقریباً ۵۰ برس حکومت کی۔ اس دور کو ہندوستان کا اور خاص کر ہریانہ کا سنہرہ دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے دورِ حکومت میں ہریانہ اور اس کے رہنے والوں کی مشکلات کچھ کم تو ہوئیں لیکن پوری طرح ختم نہیں ہوئیں۔ اس دور کو مغل حکمرانوں میں اچھے دور کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔

اکبر کے بعد اس کا بیٹا جہانگیر گدی پر بیٹھا۔ اس نے بھی ہریانہ کی حالت کے بارے میں کوئی خاص ردوبدل نہیں کی۔ جہانگیر نے ہریانہ کو اجمیر صوبے سے نکال کر دلی صوبے میں ملا دیا۔ کیونکہ ہریانہ کے دلی کے زیادہ نزدیک ہونے کی وجہ سے اس کی تہذیب و ثقافت میں کافی حد تک مماثلت تھی۔

جہانگیر کی موت کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا۔ شاہجہاں نے ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک حکومت کی۔ ان کے دورِ حکومت میں نارنول کو خاص اہمیت دے کر مکمل صوبے کا درجہ دیا گیا۔

شاہجہاں کی موت کے بعد اورنگزیب گدی پر بیٹھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ہریانہ پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اورنگزیب نے ہریانہ کے عوام پر ٹیکسوں کا مزید بوجھ لاد دیا۔ اس نے اپنی پالیسیوں کی وجہ سے یہاں کے عوام کو ناراض کر لیا۔ جس کی وجہ سے ہریانہ کے لوگ اورنگزیب کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

مغل حکمرانوں کے بعد جو ذکر ملتا ہے وہ مراٹھوں کا ہے۔ یہ طاقت مہاراشٹر کی طرف سے بڑھتی ہوئی دلی پر قابض ہوئی۔ دلی میں مغل حکمراں شاہ عالم نے مراٹھوں کو کوروکشیتر کا علاقہ دے دیا۔ مراٹھے کوروکشیتر سے آگے بڑھے اور

انہوں نے روہتک اور حصار کے علاقوں پر بھی اپنا قبضہ کر لیا۔ اور وہاں کے سرداروں کو اپنے ماتحت کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے پنجاب پر قبضہ کیا جس پر احمد شاہ ابدالی پہلے سے ہی قابض تھا اپنے بچاؤ میں ابدالی نے مراٹھوں کو پانی پت میں گھیر لیا اور یہاں دونوں فوجوں کے درمیان خوفناک جنگ ہوئی جس میں مراٹھا بری طرح ہار گئے۔ جاتے ہوئے ابدالی نے انبالہ، جیند، کوروکشیر کو سرہند کے گورنر نوین خاں کے ماتحت کر دیا۔

ہریانہ کے عوام نے نئے حکمرانوں کے تئیں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ گوڑ گاؤں میں میوؤں نے، روہتک میں جاٹوں اور رانگڑوں نے حصار میں بھٹی بشنوئی اور جاٹوں نے، کوروکشیتر کرنال میں راجپوتوں سینی اور سکھوں نے ان کی حکومتوں کی مخالفت کی۔ جس کے جواب میں ہریانہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

انگریزوں نے ہریانہ کو ترقی دینے کے لئے اس کو دو ڈویژن میں بانٹ دیا۔ دلی ڈویژن اور حصار ڈویژن۔ دلی میں روہتک، پانی پت اور گوڑ گاؤں ضلع شامل تھے۔ دوسرا تھا حصار ڈویژن جس میں حصار، سرسا اور نارنول کا علاقہ شامل تھا۔ حکومت کو اچھی طرح سے چلانے کے لئے آگے چل کر ان ڈویژنوں کو تحصیل اور سب تحصیل میں بانٹا گیا تھا۔ یہ صورتحال اس وقت تک رہی جب تک ۱۹۶۶ء میں ہریانہ ایک الگ صوبہ کی شکل میں وجود میں نہ آ گیا۔

تہذیب

ہریانہ کی سرزمین کو وید، مہابھارت پران اور گیتا وغیرہ مقدس کتابوں میں ماں کہا گیا ہے۔ ہریانہ میں کئی طرح کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں بانگرو، کھڑی بولی، ہریانوی، جاٹو، کوروی اور ہندی شامل ہیں۔ بانگرو بولی روہتک، حصار، کرنال، جیند اور دلی کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یہاں کی ہندی زبان ہریانی اور کھڑی بولی کی ہی ایک شکل ہے۔ یہ زبان ہریانہ کے بہت سے گاؤں میں بولی جاتی ہے۔

ہریانوی زبان میں سنسکرت، اُردو، فارسی، پنجابی، راجستھانی اور انگریزی زبانوں کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ اس زبان میں ہریانہ کے بہت سے ادیبوں، افسانہ نگاروں، ناول نگاروں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات لکھی ہیں۔ ہریانہ میں زیادہ تر ہریانوی زبان ہی بولی جاتی ہے۔

ہریانہ میں کئی طرح کے رسم و رواج ہیں۔ جن میں کہیں پر مذہبی اور کہیں پر سماجی اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔

یہاں کے لوگ زیادہ تر اپنے بچوں کی شادیاں اپنی برادریوں میں ہی کرتے ہیں۔ برادری سے ہٹ کر ہونے والی شادیوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکے اور لڑکی کی کنڈلی ملائی جاتی ہے۔ یہ رسم پروہت انجام دیتا ہے۔ اس کے بعد کنڈلی ملنے پر شادی طے کی جاتی ہے۔

ہریانہ میں لوگ اپنے مہمانوں کا بہت ادب کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ باہر سے آئے اپنے مہمانوں کو دیوتا تصور کرتے ہیں اور اس کی مہمان نوازی میں جان لگا دیتے ہیں۔

ہریانہ میں میلے اور تہوار زمانۂ قدیم سے منائے جاتے ہیں۔ ان میں کئی میلوں کی اہمیت مذہبی اور علاقائی ہے۔ ان میں کوروکشیتر کا سورج گرہن میلہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس میں دنیا بھر سے آئے لوگ شامل ہوتے ہیں اور مقدس تالاب میں غسل کرتے ہیں۔

اور ان میں کچھ میلے ایسے ہیں جو کسی خاص شخصیتوں کے نام لگائے جاتے ہیں ان میں مندرجہ ذیل میلے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ رام حد میلہ :۔ یہ میلہ بھگوان پرشورام کے مقدس تالاب پر لگایا جاتا ہے یہ جگہ بھگوان پرشورام کی تپسیہ کی جگہ رہی ہے۔ یہ جیند کے پاس لگایا جاتا ہے۔

۲۔ سرسوتی پراچی :۔ یہ میلہ تھانیسر کے پاس لگایا جاتا ہے۔ جہاں سے سرسوتی ندی ہو کر بہتی ہے۔

۳۔ رتن یگیہ تیرتھ :۔ یہ جگہ کوروکشیتر میں واقع ہے۔ لوگ اس تالاب میں نہاتے ہیں۔ یہ میلہ کئی دن تک چلتا ہے۔

۴۔ نوراتروں کے میلے :۔ یہ میلہ نو دن تک چلتے ہیں۔ یہ میلے بنبوری، گوڑ گاؤں، بیری اور پنچکولہ میں ماتا منسا دیوی کے مندر پر منعقد ہوتے ہیں۔

ہریانہ میں تہواروں کو دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ دیوالی، دسہرہ، ہولی بہت ہی عقیدت اور احترام سے منائے جاتے ہیں۔

ہریانہ کے رہنے والے سر پر پگڑی ضرور باندھتے ہیں۔ چاہے وہ کسی بھی مذہب و برادری کے ہوں۔ یہ سفید رنگ کا سات آٹھ گز لمبا کپڑا ہوتا ہے۔ خاص موقعوں پر خصوصی رنگ کی پگڑیوں کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جنہیں شادیوں اور تہواروں کے موقع پر سر پہ باندھا جاتا ہے۔

اسی طرح ہریانوی عورتیں گھاگرہ، سر پر اوڑھنا اور اس کے ساتھ کرتی پہنتی ہیں۔ یہ مختلف جگہوں پر مختلف رنگوں کے پہنے جاتے ہیں۔

ہریانہ کی سرزمین کو وید، پران، مہابھارت اور گیتا جیسی مقدس کتابوں کی لکھی جانے والی سرزمین ہونے کا فخر ہے۔ اس سرزمین نے مہاراجہ ہرش وردھن اور بھانو بھٹ جیسے عظیم ادیبوں کو پیدا کیا ہے۔ عظیم تخلیق کار نے بھی اسی سرزمین سے اپنی پہچان بنائی۔

ہریانوی زبان نے سنسکرت، اُردو، فارسی، پنجابی، راجستھانی، انگریزی وغیرہ زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اگر ہم اس زبان کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ نظم، ڈرامہ، ناول، افسانہ، یا ادب کی کوئی بھی صنف ہو یہاں کے ادیبوں نے ان میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔

ہریانہ کی تشکیل سے قبل ہریانہ کا اپنا کوئی عوامی رقص نہیں تھا۔ متحدہ پنجاب میں بھنگڑا اور گدا ہی عام طور پر مختلف مواقع پر پیش کئے جاتے تھے۔ جب سے ہریانہ وجود میں آیا ان کی اپنی ایک الگ پہچان بنتی گئی۔

الغرض ہریانہ کی تاریخ و تہذیب کے اس اجمالی جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کوئی بھی عہد رہا ہو۔ سرزمین ہریانہ نے اپنی انفرادی شناخت قائم رکھی ہے۔ تاریخی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی اعتبار سے یہاں کے لوگوں نے مجموعی طور پر ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کو بھی متاثر کیا۔ اس بنا پر باہر کے لوگوں نے بھی اس سرزمین سے ناطہ جوڑنے میں فخر محسوس کیا۔ جب ہم غالب جیسی ادبی شخصیت کا ذکر کرتے ہیں تو اس وقت بھی ہریانہ کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان کا ہریانہ سے خاص تعلق تھا۔ جس کی بنا پر مذکورہ کتاب کی اشاعت عمل میں آئی جس کی مکمل تفصیلات کتاب میں شامل مضامین کو پڑھ کر واضح ہو جائیں گی۔

ڈاکٹر راجندر سروپ وتس

اُردو اور ہریانوی کا باہمی رشتہ

اُردو زبان کی نشو ونما کے متعلق لسانیات کے ماہرین کی مختلف رائے ہیں۔ ان پر غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اُردو کا ہریانوی زبان سے قریب تر رشتہ ہے۔ اگر ہم سیاسی کے بجائے ثقافتی نظریے سے دیکھیں تو ہریانہ کی حدود موجودہ ریاست ہریانہ کی سیاسی و جغرافیائی حدود کے مقابلے میں وسیع تر رہی ہیں۔ آچاریہ بھگوان دیو اور جگدیو سدھانتی کی رائے میں دہلی ہریانہ کا ثقافتی مرکز رہا ہے اور اس کے سو میل کے حلقہ میں ہریانوی ثقافت کی وسعت ہے۔ اس کے مدنظر اردو پر مختلف زبانوں اور بولیوں مثلاً برج، میواتی، مغربی کھڑی بولی اور مشرقی کھڑی بولی (جس میں ہریانوی بھی شامل ہے)، کا اثر پڑا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زیادہ تر ماہرین لسانیات یہ مانتے ہیں کہ اُردو ہندی زبانوں کی نشو ونما مغربی کھڑی بولی سے ہوئی ہے جبکہ چند ایک کی رائے میں اُردو اور ہندی زبانوں کا جنم ہریانوی زبان سے ہوا ہے۔ راجا رام شاستری جیسے محققین کی یہی رائے ہے۔ جناب راجارام شاستری ہریانوی کو بولی کا درجہ نہ دے کر مکمل زبان کا درجہ دیتے ہیں۔ تاہم اتنا تو بیشتر ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ اُردو ہندی اور ہریانوی زبانوں کا قریبی رشتہ ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان تینوں زبانوں نے ایک دوسرے کو بہت متاثر کیا ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی سچائی ہے کہ وقت کے حالات اور معاملات نے اُردو اور ہندی جو کبھی ایک ہی عام فہم زبان رہی ہوں گی، اس کو دو مختلف زبانوں میں بانٹ کر رکھ دیا اور

ہریانوی کو زبان کا درجہ نہ دے کر ایک بولی کا درجہ دے دیا، حالانکہ اُردو اور ہندی کی نشوونما میں ہریانوی زبان نے ایک اہم رول ادا کیا ہے۔

آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے جب میں نے اُردو ادب کے مشہور و معروف ایک درجن سے زیادہ منتخب افسانوں کو دیوناگری میں " شناخت " عنوان سے ترتیب دیا تھا تو میں نے اس کے " پیش لفظ " میں اُردو اور ہندی زبانوں کے متعلق اپنی رائے یوں ظاہر کی تھی۔

" دو جُڑواں بہنیں۔

دونوں کا روپ رنگ اور نین نقش ایک جیسے۔

ایک جیسی چال ڈھال۔

طور طریقوں، اُٹھنے بیٹھنے اور بولنے بتیانے کے انداز میں اتنی مشابہت کہ ایک پر دوسرے کا گمان ہو۔ دونوں ایک ہی ماحول اور سرزمین پر جنمی، پلیں اور پروان چڑھیں۔

دونوں ملتیں تو باہمی ملن کا انوکھا منظر دیکھتے ہی بنتا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر نازک ہونٹوں پر دل گداز مسکانوں کا مچلنا، بکھرنا۔ ارے واہ! پائل کی میٹھی جھنکار سی دونوں کی لبھاؤنی ہنسی۔ سچ! میرے لئے اُردو اور ہندی زبانیں دو ایسی ہی جڑواں بہنوں کی حیثیت رکھتی ہیں، جن میں روپ رنگ اور نین نقش کے نظریے سے انوکھی مشابہت ہے اور جن کا ثقافتی ورثہ بہت کچھ سانجھا ہے۔ یہ ایک تاریخی سچائی ہے۔

اُردو کا جنم بھی دوسری زبانوں کی طرح سمجھنے سمجھانے کے نتیجہ کے طور پر ہُوا۔ ہندی کے بارے میں بھی یہ بیان صحیح ہے۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانیں اپنے سادہ و سہج انداز میں عوام سے ایک دم جُڑی۔ سٹی ہوئی ہیں۔ اور اگر ہم فضول کی نکتہ چینی کے پچڑے میں نہ پڑیں تو ہم ان دونوں کے اس سادہ و سہج انداز کو اس ہندوستانی کا درجہ دے سکتے ہیں جو ہمارے ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے میری یہ پختہ رائے ہے کہ ہندی اور اُردو زبانیں ایک دوسرے کو بہت کچھ دے سکتی ہیں اور مالا مال کر سکتی ہیں، اور باہمی خلوص و بھائی چارے کو مضبوط بنانے کے لئے ایک پُل کا فریضہ سرانجام دے سکتی ہیں۔[1]

---

[1] شناخت، پیش لفظ، ص ۴

مختلف محققین کی رائے میں ہریانوی زبان کا اردو اور ہندی دونوں زبانوں سے بہت گہرا رشتہ ہے اور کچھ کی تو یہ پختہ رائے ہے کہ ہریانوی سے ہی ان دونوں زبانوں کا جنم ہوا ہے۔

ہریانوی زبان و ادب کے ایک معروف ادیب و محقق جناب راجارام شاستری کی رائے میں ہریانوی کافی قدیم زبان ہے۔ اُن کی رائے میں گورو گورکھ ناتھ اور دوسرے سدھوں کی بانی میں، جو ساتویں، آٹھویں عیسوی صدی میں تخلیق پذیر ہوئی، اس پر ہریانوی زبان کا اثر دیکھا جا سکتا ہے اور اسی طرح چندو ردائی کی تخلیق "پرتھوی راج راسو" پر بھی ہے[1]

جناب راجارام شاستری اپنے اس مقالے میں - دکنی ہندی بنام ہریانوی " عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

" مطلب یہ کہ ساتویں آٹھویں عیسویں صدی میں ہریانوی زبان کا روپ صاف دیکھنے کو ملتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ اتنا وسیع ہوتا گیا کہ ہریانہ سے جو سپاہی جنگ کرنے کے لئے دکن گئے، اُن کی زبان کا اثر دکن کے لوگوں پر بھی پڑا اور وہاں کے ہندو اور مسلمانوں نے چودھویں، پندرہویں اور سولہویں صدی میں اس ہریانوی کو بطور ادبی زبان کے اپنایا۔ وہاں کے سنت ایک ناتھ، قاضی محمود بحری، ولی دکنی، عاجز، غلام نبی حیدرآبادی، سوامی پرساد، سوامی شاہ محمود حیدرآبادی، کیشو سوامی، گوپال سوامی وغیرہ دکنی ہندی کے شاعر ہوئے ہیں۔ دہلی اور اس کے گرد و نواح سے جو افواج یا دوسرے لوگ خاص کر ہریانہ کے جو پہلوان دکن میں گئے، ان کے زیر اثر جو زبان وہاں مروج ہوئی، اس کا نام دکنی ہندی رکھا گیا۔ جناب راجارام شاستری دکنی ہندی کو ہریانوی کی ایک قسم مانتے ہیں[2]

بقول جناب راجارام شاستری ہندی، اردو اور دکنی ہندی کا جنم ہریانوی سے ہوا ہے۔

---

[1] محکمہ السنہ ہریانہ کی سیمینار بابت سال ۷۶ - ۱۹۷۵ میں پڑھا گیا مقالہ "ہریانوی زبان اور ادب" ص ۲۴۹

[2] " " " " " " " " " " ۲۵۰

"تقریباً تین صدیوں تک دکن میں ہریانوی سے متاثر دکنی ہندی کا استعمال ہوا۔ لکھنؤ اور دہلی کے فارسی کے مسلم شعراء نے اس دکنی ہندی کو گنوارو نام دے کر اس میں عربی فارسی الفاظ کے استعمال پر زور دیا اور اس طرح جس نئی زبان کی نمود ہوئی، وہ اُردو کہلائی۔ اس اُردو کے خلاف اسی ہریانوی یعنی دکنی ہندی میں سنسکرت الفاظ کے استعمال سے ہندی زبان کی نشو ونما ہوئی۔ اس طرح ہریانوی زبان کی دو دھارائیں نکلیں اُردو اور ہندی" [۱]

جناب راجارام شاستری لکھتے ہیں کہ ہریانوی زبان کے اثر سے دکن میں جو دکنی ہندی مروّج ہوئی، اس کو آج بھی وہاں متعدد لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ پروفیسر سری رام شرما نے ڈاکٹر گریرسن السنائی سروے کے حوالے سے دکنی زبان کے بولنے والے لوگوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

"دکنی بولنے والوں کی تعداد اس وقت کتنی ہے؟ اس سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک نہیں دیا جاسکتا۔ آج کل کوئی انسان دکنی کو اپنی مادری زبان کے طور پر نہیں لکھواتا۔ پچھلی مردم شماری میں دکنی بولنے والے لوگوں میں سے کچھ نے اپنی مادری زبان اُردو اور کچھ نے ہندی لکھوائی۔ سنہ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کی بنا پر ڈاکٹر جی۔ اے گریرسن نے اپنے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا" میں دکنی بولنے والوں کی تعداد ۳۶۵۴۱۷۲ درج کی ہے۔" [۲]

ڈاکٹر گریرسن نے دکنی ہندی بولی والے صوبوں میں جن جگہوں کا شمار کیا ہے وہ ہیں برار، ناگپور، وردھا، چاندا، بھنڈارا، بمبئی، تھانہ، کلابہ، رتن گری، خواندیش، ناسک، احمد نگر، پونا، شولاپور، ستارہ، حیدرآباد ریاست (مراٹھواڑہ)، دھارواڑ، بیجاپور، کناڈا، وغیرہ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مغربی مہاراشٹرا اور مراٹھواڑہ میں کچھ لوگ دکنی ہندی بھی بولتے تھے۔ ان علاقوں کی زبان مراٹھی ہی تھی اور ہے۔ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے۔" [۳]

---

[۱] محکمہ السنہ ہریانہ کے سالانہ سیمینار برائے سال ۷۶-۱۹۷۵ میں پیش کردہ مقالہ "ہریانوی زبان اور ادب" ص ۲۵

[۲] دکنی ہدیہ اور گدیہ (دکنی نظم ونثر) ص ۳۱۔ مصنف پروفیسر سری رام شرما۔

[۳] سدا بہار حیرت، ایڈیٹر یوسف محمد پٹھان - ص ۶

آج کی دکنی ہندی پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف پٹھان لکھتے ہیں :-

"آج بھی اس پردیش کے ایک خاص سماج میں یہ (دکنی) بولی جاتی ہے وہ ایک زندہ زبان ہے اور پروفیسر سری رام شرما کا کہنا ہے کہ اکیلے حیدرآباد (ریاست) میں دکنی بولنے والوں کی تعداد ۳۲ لاکھ سے کم نہیں ہے۔ اس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ تمام مہاراشٹر میں مراٹھی بولنے والوں لوگوں کے بعد دکنی زبان بولنے والوں کی تعداد بھی کافی نمایاں ہے۔ کچھ مراٹھی بولنے والوں کا دکنی زبان سے بھی اچھا تعارف ہے۔"[1]

جناب راجارام شاستری دلیل دیتے ہیں کہ ڈاکٹر یوسف محمد پٹھان ہریانوی زبان کے 'او' کے دوہراؤ کے رجحان سے بے بہرہ تھے۔ اس لئے انہوں نے مراٹھی زبان میں اس رجحان کی موجودگی کی وجہ سے یہ مان لیا ہے کہ دکنی ہندی کا جنم مراٹھی اور فارسی زبانوں کے امتزاج سے ہوا ہے۔ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ نے بھی 'او' کے رجحان (مثلاً گھرو گھر) والی بات کو مانا ہے[2] لیکن انہوں نے اس کے اصل منبع کا ذکر نہیں کیا۔ جناب راجارام شاستری کا کہنا ہے کہ اس بارے میں ڈاکٹر سکسینہ خاموش رہے اور اس کو ڈاکٹر یوسف پٹھان بھی سمجھ نہیں پائے کیونکہ وہ ہریانوی زبان میں 'او' کے استعمال کے رجحان سے واقف نہیں تھے۔ ہریانوی زبان میں یہ رجحان عام ہے مثلاً گھرو گھر' ڈنڈو ڈنڈی لکو کی، داندو داندی، ہاتھوں پائی وغیرہ۔

ڈاکٹر یوسف محمد پٹھان جس دیہاتی ہندی (جو دراصل پرانی ہندی ہے) کا ذکر کرتے ہیں وہ ہی ہریانوی ہے جس سے ان تینوں زبانوں' دکنی ہندی' اور اردو' ہندی کا جنم ہوا ہے۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر شنکر لال یادو اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں۔

"ہریانوی کا اپنی نزدیکی زبان و بولیوں سے سمبندھ جان لینا کافی نہیں ہے۔ اس کی اہمیت اس نظریے سے اور بھی زیادہ ہے کہ اس نے دنیا کی دو عظیم زبانوں۔ ہندی اور اردو کو طاقت دی ہے۔ یہ ہریانوی بولی ہی دونوں زبانوں کی نشوونما کرتی رہی ہے۔

---

[1] "سدا مات چرت" ایڈیٹر یوسف محمد پٹھان۔ صفحہ ۶

[2] دیکھئے' دکنی ہندی۔ صفحہ ۴۸

کھڑی بولی کے اُوپر اس کا سیدھا اُپکار ہے (یعنی کھڑی بولی اس کی مرہونِ منت ہے) ان دونوں کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ کہیں کہیں تو خوردبین سے جائزہ لینے پر ہی فرق معلوم پڑسکتا ہے۔ اُردو کو تو اس بولی نے دکن میں جاکر پالا ہے اور وہیں بذریعہ ولی اورنگ آبادی کی شاعری اس کی نشوونما ہوئی ہے۔ [1]

دوسرے محققین نے بھی مختلف زبانوں کے مطالعہ کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسن نے اپنی کتاب "تاریخ زبان اُردو" میں کئی مفکروں کی رائے درج کی ہے۔

"قدیم اُردو سمبندھ بتلاتے ہوئے السانی تحقیق کے سلسلے میں پروفیسر ژول بلاک نے اپنے ایک مضمون "ہندی آریائی زبانوں کے کچھ مسائل" میں ہریانہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ (بلیٹن اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز۔ صفحات ۳۰۔ ۱۹۲۸) انہوں نے فرمایا ہے کہ مشرقی پنجاب کے اضلاع کی زبان فوجیوں کے ذریعے دکن تک پہنچی اور اس نے وقت گذرنے کے بعد ادبی زبان کی شکل اختیار کر لی۔ ان کا کہنا ہے کہ اُردو پر بانگرو یا ہریانوی کا اثر ہے۔ ڈاکٹر شیرانی نے ہریانی زبان کو اُردو کی پُرانی شکل کیا ہے۔" [2]

ڈاکٹر ستیا گپتا اپنے تحقیقی مقالے میں "کھڑی بولی کے دوسرے نام" عنوان کے تحت رقمطراز ہیں: "کھڑی بولی کے دوسرے نام بھی مروج ہیں لیکن وہ کھڑی بولی کے پریایہ واچی Synonyms نہیں کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ عوام کو ان سے بھرم پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ نام اس طرح ہیں۔ بانگرو، جاٹو، ہریانی، مغربی بولی ورنیکولر ہندی۔ کھڑی بولی کی بھی دو اقسام ہیں۔ مشرقی اور مغربی۔ ہریانی اور بانگرو کو علاحدہ کرنے والی کوئی حد نہیں ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں" [3] مشرقی اور مغربی کھڑی بولیوں میں بہت مشابہت ہے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے متاثر ہیں اور دونوں ہی اُردو سے قریب تر بھی ہیں۔ اُردو کو کونسی کھڑی بولی نے جنم دیا۔ اس کے بارے

---

[1] ہریانہ پردیش کا لوک ساہتیہ۔ صفحہ ۱۰۱، مصنف ڈاکٹر شنکر لال یادو۔

[2] تاریخ زبانِ اُردو، مصنف ڈاکٹر مسعود حسن صفحہ ۲۳۲

[3] کھڑی بولی کا لوک ساہتیہ، ڈاکٹر ستیا گپتا، صفحات ۱۷ - ۱۶

میں محققین کی رائے مختلف ہو سکتی ہیں لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ اُردو زبان کا جنم دہلی اور اس کے گرد و نواح کی زبان سے ہُوا ہے اور متعدد تاریخ داں اور ہریانوی ثقافت کے ماہرین دہلی کو ہریانہ کا مرکز تصور کرتے ہیں اور ثقافتی لحاظ سے اس کے ارد گرد کے ۱۰۰ میل کے دائرے کو ایک ثقافتی یونٹ خیال کرتے ہیں۔

جناب شرر فتحپوری صاحب اپنے مقالے "ہریانہ میں اُردو زبان کا ارتقاء" میں اپنی رائے کا مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار کرتے ہیں۔

"کھڑی بولی نے جو نیا روپ اختیار کیا تھا، اسے شروع شروع میں زبان دہلوی ہندی یا ہندوی کہا گیا۔ دکن پہنچ کر دکنی کہلائی اور گجرات میں گجری، پھر ریختہ، زبان اُردو، اُردوئے معلیٰ کہی گئی۔ مغربی مصنفین نے ہندوستانی یا ہندستانی کا لفظ بھی اس کے لئے استعمال کیا۔ گویا ارتقا کی جتنی منزلیں اس نے طے کیں، اتنے ہی نام اس کے پڑنے لگے" مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اردو کا ماخذ برج بھاشا کو بتایا ہے، لیکن ڈاکٹر مسعود حسین کے خیال میں اُردو کا ڈھانچا برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا ہے۔ قدیم اُردو جمنا پار کی ہریانی بولی سے قریب تر تھی۔ ڈاکٹر زور اپنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"اُردو پر بانگرو یا ہریانوی زبان کا بھی قابلِ لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف میں اس علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستے میں واقع ہے۔ اور دہلی پر حملہ کرنے والوں میں یا وہاں کے حکمرانوں کے ہمراہ اس علاقہ کے رہنے والے دہلی اور اس کے گرد و نواح میں آکر آباد ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح اور مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آرہی تھی، اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہو گیا۔" [۱]

پروفیسر ژول بلاک کے مطابق "پنجابیوں سے زیادہ ہریانہ علاقہ میں جنگی اور

---

[۱] اُردو ادب میں ہریانہ کے ادیبوں کا حصہ، صفحہ ۵۰، ۴۹

اکھڑ لوگوں کی تعداد تھی۔ سلاطین دہلی کی افواج میں بھرتی سب سے زیادہ اضلاع انبالہ کرنال، حصار اور دہلی سے جنوب میں میوات کے علاقے سے کی جاتی تھی جن کی جنگی روایات آج بھی زندہ ہیں۔ چونکہ دہلی مدتوں تک مختلف حکومتوں کا دارالخلافہ رہا، اس لئے اُردو کا تعلق کھڑی بولی سے ہے۔ گریرسن نے انھیں اضلاع کی ہندوستانی یعنی کھڑی بولی کو معیاری اور ادبی اُردو سے قریب تر بتایا ہے۔

ہریانوی اور اُردو زبان کا رشتہ کتنا گہرا ہے، اس کا اندازہ ہریانہ لوک ساہتیہ یعنی عوامی ادب خاص کر ہریانوی لوک گیتوں، بھجنوں، راگنیوں، عوامی ڈراموں یعنی سانگوں کی وارتاؤں کے مطالعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ جن میں اُردو، فارسی و عربی زبان کے بے شمار الفاظ کچھ اس انداز سے استعمال ہوئے ہیں اور وہ ہریانوی زبان میں اس قدر رچ بس گئے ہیں گویا وہ ہریانوی زبان کے ہی الفاظ ہوں نہ کہ کسی غیر زبان کے۔

ہریانہ کے دور دراز کے دیہات میں ساون کے مہینے میں گائے جانے والے گیتوں کے مندرجہ ذیل نمونے ملاحظہ ہوں جو ہریانوی اور اُردو زبانوں کے قریبی رشتہ کے حامل ہیں۔

۱۔ ہے جن کا پتی بسیں پردیس جینے سے مَر جانا
ہے باندی لیا دُو قلم دوات پتی پے گیروں پروانا

۲۔ تمبُو تو بھیجے، تمبُو کی ریسم ڈور
چار ٹکا دے گا نٹھ کا جے کوئے لسکر جائے

۳۔ نندی ایسا خط لکھوا دو۔ میرے پریتم کو بُلوا دو

۴۔ آیا تیجوں کا تہوار۔ میں کرلوں موج بہار

یہاں اس بات کا خلاصہ کر دینا ضروری ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس میں حالانکہ قلم دوات، خط، اور موج، الفاظ عربی زبان کے اور پُروانا، ریشم اور لشکر فارسی زبان کے الفاظ ہیں لیکن ایک تو ان سب الفاظ کا اندراج اُردو لغت میں ہے۔ دوسرے عوام بھی انھیں اُردو زبان کے الفاظ ہی تصور کرتے ہیں۔ اس لئے اس مقالے میں عربی

فارسی کے الفاظ کو بھی قاری کی سہولت کے لئے اُردو کے الفاظ مان لیا گیا ہے۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ عربی فارسی کے کچھ الفاظ سیدھے ہی ہریانوی زبان نے ان زبانوں سے قبول کئے ہوں اور کچھ الفاظ بلکہ زیادہ تر الفاظ بذریعہ اُردو زبان اپنائے ہوں۔

علاوہ ازیں ہریانوی کے ساون کے گیتوں میں باغ، گز، اماں، اسوار (سوار، خاطر بازار (بجار)، دربار، نگینہ، چیز، سانکل، کیواڑ وغیرہ الفاظ کا استعمال دونوں زبانوں کے قریبی رشتہ کا مظہر ہے۔ ہریانوی خواتین مختلف موقعوں پر جو لوک گیت گاتی ہیں، ان میں ہرگز، حاضر، ضرور، زیور، الماری، سیسہ (شیشہ)، سہر (شہر)، مہر، صاحب، دام، مستانہ، گلاب، جلم کشیدہ (ظلم کشیدہ)، کمر، نازک، نرم، جلاد، میزبان، نبض، بیمار، جلدی، نوکر، قمیص، دروازہ، خاص، جہاز، سپاہی، نمبردار وغیرہ اُردو کے الفاظ کا استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاں ایک طرف ہریانوی زبان نے اُردو زبان کی نشو و نما کی ہے وہاں خود بھی فارسی عربی زبانوں سے متاثر ہوئی ہے۔

ذیل میں محکمہ السنہ ہریانہ کی شائع کردہ کتاب "ہریانہ کے لوک گیت" سے چند لوک گیتوں کے اقتباس تحریر کئے جارہے ہیں جن میں اُردو، فارسی، عربی زبانوں کے الفاظ نہایت خوبصورت اور خوش اسلوبی کے ساتھ رچ بس گئے ہیں۔

ہنسلی گھڑادے فرنگی کو لڑکو   کٹھلو گھڑادے نواب

ایسی ہولی کھیلو مرگ نینی   مہاراجہ صافہ کی رکھیو لحاظ

لوگ گیتوں کی مندرجہ بالا سطور میں فرنگی، نواب، صافہ، لحاظ وغیرہ الفاظ کا استعمال جہاں ایک طرف ہریانوی زبان پر دوسری زبانوں کے پڑے اثر کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں تو دوسری طرف ہمارے مخلوط معاشرے کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ ایک اور لوک گیت کے بول ملاحظہ فرمائیں۔

رکے چنڈری تیرہ جُلم کسیدہ

کُن سے مہینے بولے مور پپیہا کب سے چمکے سیسا

سامن مہینے بولے مور پپیہا پھاگن چمکے سیسا

رکے چُنڈڑی تیرہ جُلم کسیدہ

کُن سی نند نے کاڑھیا ہے کسیدہ کن سی نے گودیا سیسا

رکے چنڈڑی تیرہ جلم کسیدہ

چھوٹی نندی نے کاڑھیا ہے کسیدہ بڑکی نے گودیا سیسا

رکے چنڈڑی تیرہ جلم کسیدہ [1]

مندرجہ بالا لوک گیت میں فارسی کے تین الفاظ ظلم، کشیدہ اور شیشہ نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں جن کا ہریانوی میں تلفظ بالترتیب جلم، کسیدہ اور سیسہ ہوگیا ہے۔ تینوں الفاظ اس لوک گیت کی روح ہیں۔

لوک گیت کا ایک اور اقتباس غور طلب ہے۔

میری نئی نئی جوانی بگاڑی رسیا میں تو دعویٰ کروں گی عدالت میں

باجرے کی روٹی چنے کا ساگ تجھے جیلوں کا پانی پلادوں رسیا

میں تو دعوا کروں گی عدالت میں

تیرا نئی دلی کا مقدمہ آگرے پہنچادوں تجھے شملے کی جیل کرادوں رسیا

میں تو دعوا کروں گی عدالت میں

سسُر کو پیش کروں جیٹھ کو پیش کروں دیور کی دیدوں گواہی رسیا

میں تو دعوا کروں گی عدالت میں [1]

مندرجہ بالا لوک گیت میں دعوا، عدالت، مقدمہ، پیش، گواہی وغیرہ اُردو فارسی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عوام تو انھیں اپنی زبان کے الفاظ ہی تصور کرتے ہیں نہ کہ غیر ملکی زبان کے۔

ہریانوی لوک گیتوں میں اُردو، عربی و فارسی زبان کے متعدد الفاظ کو علاقائی زبان کے لب ولہجہ و تلفظ کے سانچے میں ڈھال لیا گیا ہے۔ ایک لوک گیت کی مندرجہ ذیل سطور ملاحظہ ہوں۔

---

[1] ہریانہ کے لوک گیت، صفحہ ۳۱

میری ساس بڑی جلاّد کھسم میرا خونی رے
کوئے اتنی سی سُن کے بات مسافر جادو ڈاریا رے
تیری بھوت کروں میزبانی مہارے گھراں چال رے

ساس اُٹھ جلدی سی گھڑا تار ساس میں امری، ری
میرا اُٹھیا کمر میں درد پیٹ میرا دُوکھے ری
گلیاں میں ہانڈے بید نبض دکھلا دے ری
چال رے بید امہارے گھر نے تنے لین میں آئی ری
میری بہو پڑی بیمار نبض تم دیکھو رے

میرا مٹیا کمر کا درد ساس میں راضی ری
بید نے دے دے فیس میں اچھی ری

بہو نہوں نا چالو چال زمانہ کھوٹا
تیرا سسر بسے پردیس بالم تیرا چھوٹا [1]

درج بالا لوک گیتوں میں عربی زبان کے الفاظ جلاّد، مسافر، نبض اور زمانہ، فارسی زبان کے جادو، میزبان، کمر اور انگریزی لفظ فیس اس قدر رچ بس گئے ہیں، گویا وہ ہریانوی زبان کے ہی لفظ ہوں۔ یہاں قاری کو یہ بات بخوبی سمجھ لینی چاہیے کہ بہت ممکن ہے عربی و فارسی کے متعدد الفاظ ہریانوی زبان نے سیدھے ہی ان زبانوں سے اپنائے ہوں کیونکہ اردو زبان کی نشو و نما کچھ صدی پہلے ہی دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ہوئی ہے جبکہ آمد کے نظریے سے دیکھا جائے تو ہریانوی، اردو زبان سے قدیم تر

---

[1] ہریانہ کے لوک گیت،

زبان ہے۔ کئی ماہرین لسانیات تو اُردو اور ہندی زبانوں کا جنم ہریانوی سے ہوا مانتے ہیں۔
جب ہم یہ بات کہتے ہیں کہ ہریانوی اور اُردو زبانوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے تو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ ہریانوی زبان کو کبھی بھی درباری یا سرکاری یا کورٹ کچہری کی زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا، جبکہ اُردو کو ایک طویل مدّت تک راج دربار اور کورٹ کچہری اور تعلیم و تدریس کی زبان ہونے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اس لئے چاہے شروع میں اُردو کے جنم اور نشوونما میں ہریانوی زبان نے اہم رول ادا کیا ہو اور کچھ علماء نے تو دکنی اُردو کو ہریانوی زبان ہی مانا ہے لیکن بعد میں جب اُردو زبان کو راج دربار اور تعلیم و تدریس کی زبان کا درجہ حاصل ہو گیا تو اُردو نے ہریانہ کے عوامی ادب کو بہت متاثر کیا۔
ایک اور لوک گیت پیشِ خدمت ہے جو ہریانوی اور اُردو زبانوں کی قربت کی نمائندگی کرتا ہے۔

بے قدر کو دل دیا ہے دیکھنا کیسے نبھے
ایک تو سردی کا موسم دوسرے پالا پڑے
تیسرے راجا نہیں ہے رین رو رو کر کٹے
ایک تو گرمی کا موسم دوسرے لُو آں چلے
تیسرے ٹپکے پسینہ بُوند جوبن میں پڑے
ایک تو برکھا کی موسم دوسرے مینہا پڑے
تیسرے بولے پپیہا ٹیس سینے میں لگے
ایک تو ساون مہینہ دوسرے ہینڈا سے گھلے
تیسرے جھولیں گی سکھیاں چیر سینے پہ کھلے [۱]

ہریانوی لوک گیتوں کا کوئی بھی پہلو اُردو زبان سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہتا جہاں ایک طرف ایک لوک گیت میں گناہ بخش دینے کی بات کی گئی ہے تو دوسری طرف

---

[۱] ہریانہ کے لوک گیت ۔ صفحہ ۲۸۳-۲۸۱

کھیت کھلیان سے متعلقہ زرعی گیت میں اونٹ نے اپنی قسمت کا رونا یوں رویا ہے ؎

طاقت وربلوان بنا، کیوں بھونڈی شکل بنائی رے
کے بوجھے گا من میرے کی، گھنی مصیبت آئی رے
دئی خدانے ٹانگ بڑی جو دو دو گز تک جاتی رے
اوپر بوجھا الدے گھنا جب تین تین بل کھاتی رے

مندرجہ بالا سطور میں "طاقت وربلوان" الفاظ میں اُردو اور ہریانوی زبان کے الفاظ کا گنگا جمنی میل ہے۔

متعدد ہریانوی عوامی شعراء نے ہندوستانی تحریک آزادی سے متعلقہ اپنے کلام میں اُردو زبان کے الفاظ سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا ذکر قدرے تفصیل کے ساتھ ہم آگے کرینگے۔ اُردو زبان کے الفاظ کے استعمال سے گیتوں میں جوش و خروش کا جذبہ بھر دیا ہے جس کی وجہ سے عوام میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔

تحریک آزادی میں گاندھی جی عوام میں کس قدر مقبول ہوئے اور انہوں نے عوام کو بیدار کرنے میں کتنا اہم رول ادا کیا۔ اس کی ایک جھلک لوک گیتوں کے مندرجہ ذیل بولوں سے بخوبی مل جاتی ہے۔

۱- آزادی کی ہوئی لڑائی
گاندھی نے ایک فوج بنائی
برچھی تیر تلوار نہ جس پہ
ست اہنسا کا ہتھیار تھا جس پہ
لئے ہاتھ میں ترنگا جھنڈا
پھوڑا انگریزوں کا بھنڈا [1]

۲- امیر غریب میں پڑی جو کھائی
گاندھی بابو نے کونیا بھائی

---

[1] ہریانہ کے لوک گیت، صفحات ۲۹۷ - ۲۹۶

غریب مجوراں کا حق دلایا
امیراں تے یوں اُپدیس سنایا
دھن نے سانجھا سمجھو بھائی
نہیں تو کہلاؤ گے قصائی [۱]

۲۔ ہتھ کر گھے کا کپڑا پاویں
گاندھی کا فرمان بجاویں [۲]

ہریانہ کے معروف مؤرخ ڈاکٹر کے۔ سی۔ یادو نے کچھ سال پہلے اپنی دو کتابوں "ہریانہ تحریک آزادی میں کویوں، شاعروں، بھجن اُپدیشکوں اور لوک گایکوں کا حصہ" اور ہریانہ کا ضبطشدہ راشٹریہ ساہتیہ" کی تالیف کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ ان کتابوں میں ۴۹ حضرات کا کلام درج ہے۔ اول الذکر کے مقدمہ میں ڈاکٹر یادو لکھتے ہیں: "چونکہ ان دنوں ہریانہ میں اُردو کا زیادہ بول بالا تھا۔ اس لئے سب سے زیادہ تعداد اُردو کے شاعروں کی تھی۔ ہندی کا چلن تھوڑے سے شہروں و قصبوں تک ہی محدود تھا۔ اس لئے ہندی کے کویوں کی تعداد بہت کم تھی۔ بھجن اُپدیشک بہت تھے لیکن ان میں معروف و موثر تھوڑے ہی تھے اور یہی بات لوک گایکوں کی تھی۔" [۳] اس کتاب میں ۳۲ اُردو کے شاعروں، ۳ عدد کویوں، ۱۲ بھجن اُپدیشکوں اور ۳ گایکوں کی تخلیقات درج ہیں۔ ان سبھی حضرات نے ہریانہ میں تحریکِ آزادی کے دوران اپنی تخلیقات سے عوام کو بیدار کرنے اور ان میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر یادو کے یہ الفاظ غور طلب ہیں: "تحریک آزادی میں بذریعہ اُردو زیادہ کام سرانجام ہوا۔ ۴۹ حضرات میں سے ۳۲، اُردو داں تھے" ڈاکٹر یادو کا یہ بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ بوقت تقسیم ملک، ماسوائے عوامی ادب جس کا دیہی علاقوں میں بول بالا تھا، اُردو کو ہریانہ کے ادبی حلقوں میں اہم مقام حاصل تھا۔ ان حالات میں عوامی یا ہندی شاعری پر اُردو زبان کا اثر پڑنا ایک لازمی امر تھا۔

---

[۱] [۲] ہریانہ کے لوک گیت، ص ۲۹۸، ۲۹۷، ۲۹۹۔ [۳] تحریک آزادی میں کویوں شاعروں، بھجن اُپدیشکوں اور لوک گایکوں کا یوگ دان۔ تالیف کردہ ڈاکٹر کے۔ سی۔ یادو۔

ذیل میں عوامی شاعری کے چند نمونے درج کیے جا رہے ہیں جن پر اردو شاعری کا اثر صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

منوہر چندر مست کی شاعری کا ایک نمونہ دیکھیے۔

پریتم چلوں تمہارے سنگ	جنگ میں پکڑوں گی تلوار
گاڑھے کے سب وستر بناؤ	ساری پبلک کو پہناؤ
اور میں کروں سوت تیار	جنگ میں پکڑوں گی تلوار
اونچ نیچ سب کو بتلاؤ	گاندھی کا پیغام سناؤ
میں کروں نمک تیار	جنگ میں پکڑوں گی تلوار
بھارت کو آزاد کرونگی	دشمن کو برباد کرونگی
کچھ مت سوچ کرو بھرتار	جنگ میں پکڑوں گی تلوار
گاندھی جی بن رہے قلندر	شش و پنج میں پڑ گئے بندر
دیکھو بھلا کرے کرتار	جنگ میں پکڑوں گی تلوار

اس اقتباس میں جنگ، تلوار، پیغام، آزاد، برباد، قلندر، شش و پنج وغیرہ اُردو فارسی الفاظ کے استعمال سے شاعر کو اپنی تخلیق موثر بنانے اور اس میں جوش و خروش کا جذبہ پیدا کرنے و اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے میں بہت مدد ملی ہے۔

ہریانوی اور اُردو زبان کے قریبی رشتے کو تبھی سمجھا جا سکتا ہے جب ہم ہریانہ کے دیہی تخلیق کاروں کے کلام کی جانب رجوع کریں۔" دیہی علاقوں میں رہنے والے کچھ ایسے تخلیق کار بھی ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں جو دیہات میں بسنے والے عوام کے ادبی ذوق کو پورا کرتے ہیں۔ پہلے ان تخلیق کاروں کے کلام کو قابل توجہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انھیں نہ تو ادیب کا درجہ حاصل تھا اور نہ ہی ان کی تخلیقات کو ادبی زمرے میں شامل کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر میر جعفر زٹلی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے ہم عصر فارسی شعراء ان کے اُردو کلام کو کوڑا کرکٹ کہہ کر پکارتے تھے۔ زٹلی خود فرمایا کرتے تھے کہ وہ اردو زبان میں طبع آزمائی محض تفریح کی غرض سے کرتے ہیں۔ اہلِ قلم کا کچھ ایسی

قسم کا نظریہ عوامی شعراء کے بارے میں بھی رہا ہے۔ ان عوامی شعراء کے لیے اُردو ادب کی جانب سے نہایت سرد مہری کا اظہار کیا گیا اور اُن کی خدمات کے اعتراف سے بچا گیا، حالانکہ ان حضرات نے ایک حد تک عوام میں اُردو زبان کو مقبول بنانے کا فریضہ سرانجام دیا۔[1]

غالباً ۱۸ویں صدی کے آخری سالوں میں اور ۱۹ویں صدی کے شروع میں مغربی ماہرین لسانیات نے اس طرف توجہ کی تو عوامی ادب کو ادب کا حصّہ قرار دیا گیا اور یہ مان لیا گیا کہ اس سے دنیا کے مختلف حصّوں میں آباد باشندوں کے تہذیب و تمدن اور ثقافت و معاشرے سے متعلق بہت سے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔

اس کے پیشِ نظر جب میں نے ہریانہ کے عوامی ادب کی تحقیق و تلاش کا کام شروع کیا تو میں نے دیکھا کہ ہریانہ کے مختلف دیہاتوں میں سینکڑوں کی تعداد میں معروف بھجن راگنی اور منظوم قصّے کہنے والے یا گانے والے ہوئے ہیں جو دور دور تک بطور عوامی ڈرامہ نگار یا سوانگی، گلوکار اور شاعر مشہور ہوئے ہیں۔ ان عوامی شعراء کی ہریانوی زبان کی تخلیقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنی شاعری میں بڑی تعداد میں اُردو کے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور اس طرح اُردو زبان کو عوام میں مقبول بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہریانوی عوام اُردو کو (میری مراد یہاں عام بول چال کی اُردو سے ہے)، کتابی ہندی کی نسبت بہتر سمجھتے ہیں۔ ہریانہ کے عوامی شعراء کی مختلف تخلیقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں اُردو زبان کے ہزارہا الفاظ اور محاوروں کا بخوبی استعمال کیا گیا ہے یا پھر اُردو الفاظ کو علاقائی زبان کے سانچے میں نہایت چابک دستی کے ساتھ ڈھال لیا گیا ہے اور علاقائی بولی اور اُردو زبان کے الفاظ کے امتزاج سے نئے لفظوں اور محاوروں کو بنایا گیا ہے۔

محکمہ السنہ ہریانہ نے سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں ۱۹-۱۸ مارچ کو ایک سیمینار منعقد

---

[1] اُردو ادب میں ہریانہ کے ادیبوں کا حصّہ۔ ص ۶۳

کیا تھا جس میں " ہریانوی پر عربی فارسی کا اثر " عنوان کے تحت ایک مقالہ پیش کیا تھا جس میں کوئی سوا تین سو عربی فارسی الفاظ کی ایک فہرست درج کی تھی جو ہریانوی زبان میں بھی اپنے اصل یا کچھ بدلے ہوئے روپ میں استعمال ہوتے ہیں اور اسی طرح فارسی زبان کے تقریباً ڈیڑھ سو مصادر کی بھی ایک فہرست دی تھی جن سے ہریانوی زبان نے استفادہ کیا ہے۔[1]

ہریانہ کے دیہی علاقوں میں عوامی شعراء، بھجن اُپدیشک یا عوامی ڈرامہ نگاروں یعنی سانگیوں نے جو بے شمار تخلیقات اپنی علاقائی زبان میں کی ہیں۔ اگر ان میں استعمال شدہ عربی فارسی اور اُردو زبان کے الفاظ کی مکمل فہرست تیار کی جائے تو اُن کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جائیگی اور ان الفاظ کا استعمال عموماً روزمرّہ کی بول چال میں ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہریانوی اور اُردو زبانوں کا رشتہ صدیوں کی قربت و ہم آہنگی کا رشتہ ہے۔

ہریانہ کے عوامی شعراء کے کلام پر اُردو زبان کے اثر اور ہریانوی و اُردو زبانوں کے باہمی رشتہ کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ سانگوں یعنی عوامی ڈراموں، راگنیوں، گیتوں و بھجنوں کے تخلیق کاروں و قصہ گوؤں کے متعدد قلمی نسخے فارسی رسم الخط میں پائے گئے۔ عوامی شعراء کے کلام سے متعلق تحقیق کے دوران فارسی رسم الخط میں لکھے متعدد قلمی نسخے میری نظر سے گذرے ہیں جن میں لاڈولے سے حاصل کردہ احمد بخش کے سانگ "جے مل فتہ" کا اور ایک نامعلوم عوامی شاعر کی تصنیف "سوانگ رکمن منگل" کے نسخے اب تک میرے ذاتی ذخیرے میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں تقریباً دو درجن سوانگوں کے قلمی نسخے کوروکشیتر کے بعض اہل علم حضرات کے پاس موجود ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر نسخوں کا مطالعہ میں نے بذات خود کیا ہے ان نسخوں پر اُردو زبان کا گہرا اثر ہے۔ کہیں کہیں تو مکمل بند ایسے ہیں جنہیں آسان اُردو کا نام دیا جاسکتا ہے۔

چوبولوں اور مختلف بحر کے گیتوں میں لکھی سون کے شادی لال کی رامائن اور پونڈری قصبے کے لالہ دیوت رام کی رامائن پر اُردو زبان کا اثر صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے۔

---

[1] محکمۂ السنہ ہریانہ کی سالانہ رائٹرز سیمینار برائے سال ۷۸-۱۹۷۷ء میں پیش کیا گیا مقالہ " ہریانوی پر عربی فارسی کا پربھاؤ" مصنف ڈاکٹر وشنودت بھاردواج ، ص ۲۰۶ - ۱۹۳

جسونت سنگھ ٹوہانوی کی مشہور تخلیق آریہ سنگیت رامائن کی زبان تو اُردو زبان سے نزدیک تر نظر آتی ہے۔ فارسی رسم الخط میں لکھی عام ہندوستانی زبان کی یہ تخلیق عوام میں بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ عوام کی زبان کا استعمال اور مانوس بحروں میں لکھا جانا ہے۔ یہ رامائن شمالی ہندوستان، خاص طور پر پنجاب، ہریانہ، یو۔پی وغیرہ صوبوں میں بے حد مقبول ہوئی، اس تصنیف کے بیشتر مکالمے اور گیت ایسے ہیں جن کی زبان اُردو یا اُردو کے قریب تر کہی جا سکتی ہے۔

مکالمے کا ایک نمونہ دیکھئے۔

رام چندر جی ــــ منی جی، یہ کونسا مقام ہے؟
وشوامتر ــــ ماریچ اور سُباہو کی ماتا تاڑکا کا اسی جنگل میں قیام ہے۔
رام چندر جی ــــ کیا وہ بھی اپنے بیٹوں کی طرح بد کار ہے؟
وِشوامتر ــــ اعلیٰ درجہ کی ظالم اور جفا کار ہے۔
رام چندر جی ــــ چلو تو آگے قدم بڑھاؤ۔
وشوامتر ــــ نہیں پہلے اس کی مٹی ٹھکانے لگاؤ۔[1]

مکالمے کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

لکشمن جی ــــ کیا ماریچ کی بھی اسی جگہ بود و باش ہے؟
وشوامتر ــــ ہاں، یہ تمام جنگل اس کی میراث ہے۔
لکشمن جی ــــ آخر کوئی خاص مقام؟
وشوامتر ــــ جہاں مل جائے مال حرام۔
رامچندر جی ــــ تو یوں اس کا پتہ کس طرح پائے گا؟
وشوامتر جی ــــ وہ خود ہی بھاگا بھاگا آئے گا
رامچندر جی ــــ بہت مغرور ہے؟
وشوامتر جی ــــ یہ تو ساری دنیا میں مشہور ہے۔[2]

---

[1] آریہ سنگیت رامائن، مصنف جسونت سنگھ ٹوہانوی، صفحے ۱۰۲ - ۱۰۰

[2] ایضاً ۱۰۲-۱۰۳

جسونت سنگھ ٹوہانوی کی مختلف بحروں، دوہوں، چوبولوں پر منحصر گایکی کا انداز بھی نہایت پُرکشش تھا۔ ایک نمونہ دیکھئے :-

ماریچ کا گانا (دوہا)

ایک عورت کو قتل کر، اچھل رہا رک بیچ
بچ کر جائے گا کہاں، آپہنچا ماریچ

چوبولا

آپہنچا ماریچ سنبھل کر آگے قدم بڑھانا
خبر نہیں شاید تجھ کو جانے ہے مجھے زمانا
ناممکن ہے آج تمہارا یہاں سے زندہ جانا
مل لو جل لو جس سے ملنا کھالو جو کچھ کھانا

دوڑ

قضا ہے سر پر چھائی، حماقت تجھ سمائی، جہنم تجھے پہنچاؤں
لوں بدلا، جسونت سنگھ میں تب ماریچ کہاؤں[1]

گانا رام چندر جی کا (دوہا)

کیوں زیادہ بک بک کرے، رکھ زبان کو بند
ماں تو تیر چلا چکی۔ اب آئے فرزند

چوبولا

اب آئے فرزند، بہت کچھ یہی جتلاتا ہے
بے ایمان بد زبان کیوں سر پر چڑھتا آتا ہے
ہٹ پیچھے مردود مفت کیوں بدبو پھیلاتا ہے
اب بھی آجا باز جان کی خیر اگر چاہتا ہے

---

[1] آریہ سنگیت رامائن مصنف جسونت سنگھ ٹوہانوی۔ ص ۱۰۳-۱۰۴

زمانے بھر کے گنڈے، چلا جا ٹھنڈے ٹھنڈے، آجا اگر بدلہ لینا
کل کو پھر جسونت سنگھ کو ناحق دوش نہ دینا۔

ٹوہانوی کی زبان مخلوط زبان تھی جس میں علاقائی ہریانوی، اردو اور ہندی تینوں زبانوں کے الفاظ کی آمیزش تھی جسے شمالی ہندوستان میں دور دور تک بھی جانے والی عوام کی زبان کہا جاسکتا ہے۔ ٹوہانوی کی زبان اُردو سے قریب تر ہے۔ اس کے برعکس احمد بخش تھانیسری کی رامائن میں علاقائی زبان کا غلبہ زیادہ ہے لیکن اس کی زبان بھی اُردو سے ضرور متاثر ہوئی ہے۔ ایک نمونہ دیکھئے۔

(دوہا تارا رانی کا ۶۷)

ہا ہا پریتم کہاں گئے نہیں بولت مجھ ساتھ
انگد تمرے پُتر کے کون دھرے سر ہاتھ
عمر ناداں ستایا بچے کو
نہ علم پڑھایا پرنایا نہ شستر سکھایا بچے کو
نہ راج نیت کی جانے ریت کس کے گل لایا بچے کو

فارسی رسم الخط میں شائع شدہ پونڈری کے لالہ دیوت رام کی بحر طویل، لاونی، خیال وغیرہ بحروں و طرزوں اور مختلف راگ راگنیوں کی شکل میں تخلیق شدہ رامائن بھی پونڈری اور اس کے نواحی علاقے میں بے حد مقبول ہوئی۔ اس کی زبان پر احمد بخش کی رامائن میں استعمال کی گئی۔ تھانیسر کی علاقائی زبان سے مقابلے میں اُردو زبان کا اثر زیادہ پڑا ہے۔ دیگر عوامی شعراء جن کی تخلیقات کے فارسی رسم الخط میں لکھے نسخے میری نظر سے گذرے، ان میں کامی گاؤں ضلع سونی پت کے ایک پنچ سے حاصل کردہ پنڈت لکھمی چند کے چار سانگوں کے نسخے، باجے بھگت کی راگنیوں اور سانگوں کے نسخے، مانگے رام کا نل دمینتی سانگ کا نسخہ وغیرہ شامل ہیں۔ پنڈت لکھمی چند کے سب سے چھوٹے مرید جناب ظہور احمد ظہور کے پاس فارسی رسم الخط میں لکھمی پنڈت لکھمی چند کی تقریباً سبھی تخلیقات موجود ہیں۔ واضح رہے ان قلمی نسخوں میں کثیر تعداد میں اُردو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔

اس طرح کرانس گاؤں میں بھیارام، سناری ضلع روہتک کے جموامیر، علی بخش نارنوند ضلع حصار کے رام کشن بیاس، ندانہ گاؤں ضلع روہتک کے روی سروپ اور دھنپت سنگھ ڈوم، ایچرا ضلع جیند کے جگدیش چندر، روہتک کے سوہن لال سوامی وغیرہ کی تخلیقات پر اُردو زبان کا اثر صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔

اُردو زبان کو مقبول عام کرنے میں سانگیوں یعنی عوامی ڈرامہ نگاروں نے زبردست رول ادا کیا ہے۔ ان عوامی ڈرامہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں بے شمار اُردو زبان کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ سوانگوں کے نثری حصہ یعنی گفتگو میں اُردو الفاظ کی چاشنی کافی زیادہ ہوتی تھی۔

ان عوامی شعراء و ڈرامہ نگاروں میں جو زیادہ مشہور ہوئے ان میں دیپ چند، احمد بخش، علی بخش، جسونت سنگھ ٹوہانوی، لکھمی چند، باجے بھگت، مانگے رام، دھنپت رام، جموامیر، رام کشن بیاس، ہردیوا سوامی وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں بھی دیپ چند احمد بخش، جسونت سنگھ ٹوہانوی، لکھمی چند اور مانگے رام کے نام خاص توجہ کے قابل ہیں۔ جسونت سنگھ ٹوہانوی اور احمد بخش تھانیسری کے کلام کے نمونے پہلے ہی پیش کئے جا چکے ہیں۔

عوامی ڈرامہ نگاروں اور شعراء میں پنڈت لکھمی چند کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ناخواندہ تھے لیکن پھر بھی انہوں نے ہریانوی زبان کے ساتھ ساتھ اُردو، فارسی اور سنسکرت زبانوں کے الفاظ اس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کئے ہیں کہ ان کی شاعری کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

ذیل میں ان کی شاعری اور تخلیقات میں استعمال ہوئے کچھ اُردو الفاظ کی فہرست غور طلب ہے۔ نقل، قتل، بدنامی، حرامی، غلامی، سیلانی، حامی، زردی، نامردی، عالم، ظالم، معلوم، لگام، غلام، تمام، صبح شام، کلام، سلام، روبرو، صبر، خبر، سزا، قضا، مجبور، قصور، حضور، بیمار، گلزار، چشم، قسم، اعتبار، دلدار، تابعدار، زار، بزار، قرض دار، اختیار، تدبیر، ایمان، نقصان، اعلان، شیطان، نادان، بے وارث، بے درد، بے قصور، تقاضا، بے ایمان، اخلاص، کم ذات، ملاقات، جوئے باز،

تخمی، تخت، تاج، زمین، خاموش، وزیر، فقیر، غضب، عزت، عشق، معشوقہ آبرو، خوش، خود، خلق، خالق، ناحق، نقشہ، نالائق، جنگ، قید، حقیقت، حکم، مضمون، فرض، درگاہ، رعیت، راز، زر، زبان، یقین، پائیدار، رتبہ غصہ، شادی، بدی، دروازہ، درخواست، ہرگز، گردش وغیرہ "[1] یہ سبھی الفاظ اُردو زبان سے لئے گئے ہیں لیکن ان میں سے بہت سارے الفاظ کا تلفظ علاقائی بولی کے مزاج کے مطابق ڈھال لیا گیا ہے۔

دراصل لکھمی چند کی کئی تخلیقات ہریانہ کی گنگا جمنی زبان کے عمدہ نمونے ہیں۔ مثال کے طور پر پُورن بھگت کے سانگ کی یہ راگنی دیکھئے ؎

مت لے شادی کا نام پتا میں جتی رہوں گا۔ ٹیک۔

چھوڑ دے جو ترشنا کے رگڑے — ہم سیں بھجن کرن میں تگڑے
جو دنیا کے جھگڑے بنے تمام — دور میں کتی رہوں گا
میں قاعدے سے نہیں گھٹوں گا — اس بندھن سے الگ ہٹونگا
ہرنے رٹوں گا صبح و شام — دیا کا پتی رہوں گا
کروں بھجن ہری کے رُکھ میں — جب میرے دن ٹوٹیں گے سُکھ میں
دُکھ میں دے راکھی سے لگام — ناگر بھنگ مُتی رہوں گا
لکھمی چند صرف کہے گن کے — دھن پروست بنا دیا جن کے
مات پتا کے بن کے غلام — کرشدہ متی رہوں گا[2]

مندرجہ بالا راگنی میں جہاں ہریانوی زبان کے رگڑے، تگڑے، جن کے، پروست وغیرہ الفاظ کا اور ہندی کے ترشنا، بھجن، متی، گتی، سُکھ، دُکھ، شدہ وغیرہ الفاظ کا برموقعہ و باحول استعمال کیا گیا ہے، وہاں اُردو کے شادی، دنیا، تمام، لگام، صرف غلام وغیرہ الفاظ کے ساتھ ہریانوی اور ہندی کے الفاظ کے ساتھ جو عمدہ تال میل بٹھایا گیا ہے

---

[1] سانگ سمراٹ پنڈت لکھمی چند، مصنف ڈاکٹر راجندر دتس، ص ۲۱۹، ۲۲۰

[2] رتن کوش، جلد اول، اڈیٹر لکشمی نارائن شرما، سانگ پورن بھگت، ص ۶۶

وہ ان زبانوں کے قریبی رشتے کا مثبت ثبوت ہے۔ لکھمی چند کے بھجنوں اور راگنیوں کو اُردو زبان نے کس قدر متاثر کیا ہے، اس امر کو اُجاگر کرنے کے لئے ایک دو گانے کی طرز پر لکھی مندرجہ ذیل راگنی کی مثال غور طلب ہے۔

موہی — تیرے بولاں کی میری چھاتی کے ماں کرڑی داب ہے
دے دے میرا رومال کیوں تیری عقل خراب ہے

پُورن — موہی کے سووے کیوں نہ جاگے، کیوں نہ بدی کا رستہ تیاگے
چلے جب دھرم راج کے آگے، میرا محرم جواب ہے

موہی — منے نیوئے برتھا زندگی کھوئی، پورن بن بیٹھا نرموہی
توں بھورا بن کے لے خشبوئی، رُت پے پھول گلاب ہے

پورن — بگڑجیاں گے چندرما سے چہرے، جگر میں کردئے زخم بھیترے
جرٹے کے بھرتے شیر گھیرے، گا دڑ کی کے تاب ہے

ایک وقت تھا جب ہریانہ میں بحر طویل کی طرز عوام میں بے حد مقبول تھی، جسونت سنگھ ٹوہانوی کی رامائن کے مقبول ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں متعدد گانے بحر طویل جیسی مقبول طرز و بحروں پر لکھے ہوئے ہیں۔ لکھمی چند نے بھی بحر طویل کی طرز پر کئی راگنیوں کی تخلیق کی ہے۔ ایک راگنی کی چند سطور نمونے کے طور پر پیش ہیں ؎

لکھمی چند کر صبر، یہ دُکھ سب سے زبر، مجھ کو پٹے کی خبر، یہ جھوٹی صفائی
کیا تھوکے گا عالم، بنیا جننی کا بالم، پکڑی موہی کی ظالم، کیوں نرم کلائی

پنڈت لکھمی چند کے بعد ان کے مرید پنڈت مانگے رام بھی سرزمین ہریانہ کے مشہور عوامی ڈرامہ نگار گذرے ہیں جن کی شاعری پر اُردو زبان کے اثر سے متعلق ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ متھانا لکھتے ہیں :-

" پنڈت مانگے رام کی شاعری میں عوام میں مروج اُردو زبان کے الفاظ کا استعمال ہوا ہے، مثلاً شاعر، دلدار، دربار، تابعدار، زبان، تقدیر، رضا، دستور، قاعدہ، شہزادہ، حور، نور، محبت، مثل، دخل، ظلم، ستم، جہاں، غلام، شیر، شراب، فقیر، تصوّر،

عشق ، عاشق ، معشوق ، حمایتی ، شمشیر ، مسافر ، پرگنہ ، فرصت ، زمانہ ، گلزار ، اقرار ، بے شمار ، وفا ، خدمت گار ، گردش ، شخص ، مقام وغیرہ۔[1]

پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں سوانگی کی حیثیت سے پنڈت دیپ چند کا نام سرفہرست تھا۔ ہریانوی زبان میں لکھے اور اسٹیج کیے ان کے سوانگوں اور راگنیوں سے متاثر ہو کر یو۔ پی ، ہریانہ اور راجستھان وغیرہ سے ہزاروں کی تعداد میں نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ انھیں خدمات کے عوض انگریز حکومت نے 'سَر' کے خطاب سے انھیں سرفراز کیا تھا۔ ان کی ایک راگنی کا بند (اُڑے کی بجائے یہاں اور اُ کٹھے کی بجائے وہاں) ترمیم کے ساتھ پیش کر رہا ہوں ؎

یہاں ملیں تنے ٹوٹے لیتر ، وہاں ملیں فل بوٹ ، بھرتی ہو لو رے
یہاں ملیں تنے پھاٹے چیتھڑے ، وہاں ملیں گے سوٹ ، بھرتی ہو لو رے
یہاں ملیں تنے سوکھے ٹکڑا ، وہاں ملیں بسکٹ ، بھرتی ہو لو رے
یہاں ملیں تنے دھکا مکی ، وہاں ملیں سیلوٹ ، بھرتی ہو لو رے

راگنی کے مندرجہ بالا بند سے دو نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ عوامی شاعر نے اپنی آسان و سہل اور عام فہم زبان میں دوسری زبان کے الفاظ۔ یہاں پر انگریزی کے الفاظ فل بوٹ بسکٹ ، سوٹ اور سیلوٹ کو موثر ڈھنگ سے عوام تک پہنچانے کا فریضہ سرانجام دیا گیا ہے۔ کہ وہ عوام کی زبان کا حصہ بن گئے۔ دوسرے یہ کہ ہم اس زبان کو ہندی زبان کی نسبت اُردو زبان سے زیادہ قریب پاتے ہیں۔ عوامی ڈرامے یا سانگ کی زبان کے متعلق ایک معروف محقق جناب راجارام شاستری لکھتے ہیں۔

" سوانگ کی زبان میں کئی روپ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گفتگو کی زبان اُردو زبان کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً راماند ماسٹر کے سوانگ " راماند موہنا دیوی " کے شروع میں درج ڈائیلاگ سے پتا چلتا ہے جہاں وہ شروع میں کہتے ہیں۔

" برادرانِ عزیز ، مجلس صاحب وغیرہ ۔۔۔۔۔۔ "[2]

---

[1] ہریانہ سانگ پرمپرا اور تروینی کوی پنڈت مانگے رام مصنف ڈاکٹر رگھوبیر سنگھ متھانا ص ۱۷۷

[2] ہریانہ کا لوک ساہتیہ مصنف راجارام شاستری۔ ص ۱۴۱

ہریانوی اور اُردو کا ایک دوسرے سے کتنا گہرا رشتہ ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور کڑی ہے قصہ گوؤں یا بھجن گیتوں یا شاعری کی۔ یہ ایک طرح کے گیت کار اور گلوکار ہوتے ہیں جو عوام کی دلچسپی کے مدّنظر نظم کی شکل میں متفرق بھجن یا بھجنوں کی شکل میں منظوم قصوں کی تخلیق کرتے ہیں۔ ہریانہ کے عوامی ڈرامہ نگاروں یا سانگیوں میں سے بیشتر نے بھجنوں یا راگنیوں کی شکل میں منظوم قصوں کی تخلیق کی ہے۔ ان راگنیوں یا بھجنوں کو نثر یا گفتگو کی مدد سے ایک لڑی کی شکل میں پرو دیا جاتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ شروع میں بھجن یا گیت بھگتی تحریک سے وابستہ رہے لیکن بعدازاں متعدد موضوعات پر بھجنوں یا راگنیوں کی تخلیق ہونے لگی۔ ہریانہ کے معروف شعراء ہیں۔ شنکر داس، نیت رام، روی سروپ، جوامیر، لکھمی چند، مانگے رام، بھیا رام، مہر سنگھ، موہر سنگھ، نندلال، سکھی رام، سروپ لال، رام پرساد، جگدیش چندر، مائی رام، گیانی رام وغیرہ شعرائے اُردو زبان کے بے شمار الفاظ کو اپنی تخلیقات میں بہت خوبی سے استعمال کیا ہے۔ ان الفاظ کے استعمال سے ان کی شاعری اور زیادہ پُرکشش اور موثر بن گئی ہے

ہری کیش پٹواری کے ایک بھجن کی چند سطور پیش خدمت ہیں جہاں انہوں نے نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ گنگا جمنی زبان کا استعمال کیا ہے۔

کرم لکھا پھل پڑے بھوگنا نہیں کوئی تدبیر بنے
کرم سے راجا سیٹھ بادشاہ کرم سے ننگ فقیر بنے
کرم اُتارے گدی پر سے کرم سے تخت و تاج ملے
کرم سے بگھی پنس پالکی موٹر ہوائی جہاز ملے
کرم چڑھے تو فوج رسالے بھومنڈل کا راج ملے
کرم اُتر جا کے خزانے نہیں پیٹ بھر اناج ملے
بھاگیہ وان کے سدا درت میں حلوہ پوری کھیر بنے
کرم سے مورکھ کرم سے گیانی کرم سے کائر سُورا ہو
کرم سے ڈاکو جعلساز بدمعاش چور ٹھگ پورا ہو
کرم سے بھوگی کرم سے روگی کرم سے کبُرا کورا ہو

کرم سے سوہنا، کرم سے بھونڈا کرم سے کالا بھُورا ہو
کرم سے زبل کرم سے یودھا بلی پیغمبر پیر بنے
بنا کرم نا بنے سنیاسی کرم سے بڑا وزیر بنے

زمانہ حال کے ایک عوامی شاعر و قصہ گو نے "چندر گپت، شہزادی جہاں آرا،" عنوان کے تحت ایک قصہ لکھا تھا۔ اس قصے کی نثر کا ایک نمونہ دیکھئے:۔

"سجنو! سکندر بادشاہ نے یونان سے اپنا جانشیں بیٹا سیلوکس ہندوستان کو فتح کرنے کے لئے بھیجدیا۔ اس پر چندر گپت راجا کو پتہ چلا تو اپنی فوج لے کر دریائے سندھ کے کنارے دشمن کو روک دیا۔"

مندرجہ بالا اقتباس اس کا واضح ثبوت ہے کہ تخلیق کار کی زبان اُردو زبان سے متاثر ہے۔ چاہے یہ زبان اُردو ادب کے معیار پر کھری نہ اُترے لیکن دیہات میں بولی جانے والی زبان سے اس کا قریبی رشتہ ہے۔

ہریانہ میں میوات کے علاقے میں کئی معروف عوامی شاعر گذرے ہیں جن میں سعداللہ کا نام سرفہرست ہے۔ ان کی تخلیق "مہابھارت" تو مقبول عام ہے۔ ان کے یہاں اُردو، ہندی، میواتی زبانوں کے الفاظ کا استعمال نہایت چابک دستی سے کیا گیا ہے۔ دو نمونے ملاحظہ ہوں ؎

تیرے روپ پہ فدا اور رُوپ بد رنگ
گھنی چڑھاکے دیکھ لی، نیچے پڑی پتنگ

یا پھر ؎

پَل میں کوُپ تالاب سُکھا دے
پَل میں کر دے جل تے تھل
پَل میں بھیک منگا دے بندے
جس کے سنگ ہو لشکر دَل
پَل میں دل کا ایک بنا دے
پَل میں پرواروں کا دَل

سعد اللہ کا ہے کا ڈر ہے
کرتا لاگے گھڑی نا پل

کسی زمانے میں ہریانہ کے قصبوں میں، مثلاً دادری، نارنول، بھوانی، انبالہ وغیرہ میں لاونی کی گایکی اور خیال بازی کا رواج تھا۔ یہ بھی ایک قسم کے عوامی شاعر تھے۔ اِن قصبوں میں ان کے باقاعدہ اکھاڑے تھے اور مختلف اکھاڑوں کے لاونی بازوں' خیال بازوں' کے شعر و شاعری کے مقابلے منعقد ہوتے تھے۔ ان خیال بازوں کے کلام میں اُردو اور ہریانوی یعنی علاقائی بولی کے الفاظ کا خوبصورت امتزاج ہوتا تھا۔ قصبہ دادری سے تعلق رکھنے والے اور ریاست جیند کے دربار سے' راج کوی' کے لقب سے سرفراز ہونے والے ہریانہ کے معروف کوی شمبھو داس کے ہندی اور علاقائی زبان میں تخلیق شدہ 'رکمنی منگل' میں اُردو الفاظ کی چاشنی بہت نمایاں ہے۔ اور اسی طرح اُردو زبان میں تخلیق شدہ ان کے کلام میں یعنی ہریانوی زبان کے الفاظ کا خوبصورت امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ میں نے بذاتِ خود ان لاونی بازوں' اور خیال بازوں' کے فارسی رسم الخط میں لکھے متعدد قلمی نسخے دیکھے ہیں اور ان کی زبان کا جائزہ بھی لیا ہے۔ تقریباً ان سبھی تخلیقات میں ہریانوی اور اُردو زبان کے الفاظ کا امتزاج دیکھا گیا ہے۔ بلاشک ہریانہ میں ادب، جس میں عوامی ادب و شاعری بھی شامل ہے، کی روایات بہت قدیم رہی ہیں۔ افسوس ہے کہ اس ادب کا بیشتر حصّہ گردشِ ایام کی نذر ہوگیا۔ اس مطالعہ سے یہ نتیجہ بہ آسانی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہریانوی اور اُردو کا باہمی رشتہ بہت قریبی ہے۔ دونوں میں زبانیں ایک دوسرے کی مرہونِ منت ہیں اور دورِ حاضر میں بھی ہریانوی زبان کی تخلیقات اُردو زبان و ادب سے متاثر ہیں۔ اُردو زبان کے ہزارہا الفاظ ہریانوی زبان میں بڑی خوبصورتی سے رچ بس گئے ہیں جو ان زبانوں کی باہمی ہم آہنگی اور قریبی رشتے کا مثبت ثبوت ہے۔

کمال احمد صدیقی

غالبؔ کے اَجداد

خواجہ الطاف حسین حالیؔ پانی پتی خود کو غالبؔ کا شاگرد مانا ہے، اور اس پر فخر کیا ہے۔ غالبؔ اور حالیؔ کے درمیان بیت بحث بھی ہوئی تھی، جس کی تفصیل یادگارِ غالبؔ میں ہے۔ لیکن حالیؔ کے نام غالبؔ کا کوئی خط نہیں ہے۔ غالبؔ کے خطوں کا پہلا مجموعہ "عودِ ہندی" ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "اُردوئے معلّیٰ" جس میں میر مہدی مجروحؔ پانی پتی کا دیباچہ شامل ہے، ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو شائع ہوا۔ شروع میں جب خط کتابی صورت میں شائع کرنے کی تحریک مرزا غالبؔ کے کچھ شاگردوں نے کی۔ تو انھوں نے اس بات کو پسند نہیں کیا۔ لیکن پھر خود انھوں نے اس میں دلچسپی لی۔ غلام محمد غوث خاں بےخبرؔ نے ۱۸۶۱ء میں خط جمع کرنا شروع کیے۔ خود غالبؔ نے اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ اس ہاتھ بٹانے کے عمل میں عبارتیں بھی منسوخ کی گئی ہیں یا ان میں اصلاحیں بھی کی گئیں۔ نثری یا شعری تخلیق میں اصلاح کا حق مصنف کو ہوتا ہے۔ خطوں میں اصلاحیں ہوں تو اُن کی دستاویزی قیمت گر جاتی ہے۔ غالبؔ کے خطوں میں جہاں اُن کی عمر کا ذکر ہے، تاریخِ ولادت ۱۲۱۲ ہجری نکلتی ہے۔ لیکن جہاں روانی میں واقعات بیان کیے ہیں یا جو تحریریں باقی رہ گئیں، وہاں دوسری کہانی ہے۔ "غالبؔ کی شناخت" میں تیسرا باب ہے۔ "میرزا کا سنہ ولادت"۔ تفصیل اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ۲۱ جون ۱۸۶۸ء کو علاؤالدین خاں علائی کو جو خط غالبؔ نے لکھا، اس میں اپنی عمر

چارکم اسی برس، یعنی ۷۶ برس بتائی ہے۔ گویا ان کی ولادت سنہ اس خط کے اعتبار سے ۱۷۹۲ء ہے جبکہ معروف سنہ ولادت ۱۷۹۷ء ہے۔

اے برادر جان برابر و والد صفت عزیز تر از جان میرزا علاؤالدین خانکو دعائیں کہ [illegible]
غالب دیوانہ بہیجی سال نگارش تمکو یاد ہوگا میں نے دلستان فارسی کے
انکو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل تمکو لکھدیا ہے اب جو
چار کم اسی برس کے عمر ہوئے اور جانا کہ تشنۂ سیر زندگی برسون کیا
بلکہ مہینوں کی بھی نہیں ہے کلام ہے شاید بارہ مہینے
ایک برس کہتی ہیں اور جیون ورنہ ۵ چار مہینے پانچ سات مہینے دس
بیس دن کی بات رہ گئی ہے اپنی نجات جو اس میں اپنی دستخط
سے یہ توقیع تمکو لکھدیا ہوں ہر فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین
ہو جائیے ہر میرے جاننے والی تمکو میری جگہ جانیں جیسے مجھکو جانتی تھی
ویسے تمکو جانیں اور جس طرح مجھکو مانتی تھی تمکو مانیں کل شیء ہالک
الا وجہہ ذوالجلال والاکرام یکشنبہ سلخ [illegible] شہر شوال
[illegible]

حقیقت یہ ہے کہ میرزا کا سنہ ولادت ۱۷۹۲ء نہیں بلکہ اس سے بھی پانچ برس پہلے ۱۷۸۷ء ہے۔ غالب کی شناخت (ص ۶۹) یہ عبارت نقل کی جاتی ہے۔

"میرزا کی وفات پر میرٹھ کے لارنس گزٹ نے جو خبر چھاپی تھی، اس میں میرزا کی عمر تخمیناً بیانئی سال بتائی تھی۔ یہ بات قوی امکانات میں سے ہے کہ عمر کے بارے میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے رجوع کیا گیا ہوگا۔"

موضوع پر معروضات پیش کرنے سے پہلے یہ گذارش ضروری تھی، کیونکہ میرزا غالب کے اجداد اور خاندان کے بارے میں ساری معلومات کا ماخذ خود میرزا کے بیانات ہیں۔ ان بیانات کو جوں کا توں تسلیم کرلینا سخن فہمی کے بغیر غالب کی طرف داری ہوگی۔ تعلّی ہی سہی، غالب نے کہا تھا۔

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں

حالی، غالب کے سوانح نگار ہی نہیں انھوں نے شخص و شاعر غالب کو ادبی دنیا سے متعارف کرایا۔ غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا بڑا حصہ 'یادگارِ غالب' کا یا تو خلاصہ ہے یا تشریح۔ باقی حصہ کا زیادہ حصہ خطوطِ غالب کی عبارتوں کی مختلف ترتیبوں پر مبنی ہے یادگارِ غالب اور خطوطِ غالب کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن غالب کو سمجھنے کے لئے ان کے جادو کے حصارے باہر ان کے بیانات سے استنباط کرنا ضروری ہے۔ اس لیے بھی کہ حالی نے بھی غالب کے بیانات کو بنیادی حقیقت سمجھا ہے۔

"مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال، جیسا کہ انہوں نے جا بجا اپنی تحریروں میں ظاہر کیا ہے، یہ ہے کہ اُن کے آبا و اجداد ایک قوم کے تُرک تھے، اور ان کا سلسلۂ نسب تو ابن فریدون تک پہنچتا ہے۔ جب کیانی تمام ایران و توران پر مسلّط ہو گئے، اور تورانیوں کا جاہ و جلال دنیا سے رخصت ہو گیا، تو ایک مدت دراز تک ملک و دولت سے بے نصیب رہی، مگر تلوار کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ کیونکہ ترکوں میں قدیم سے یہ قاعدہ چلا آتا تھا کہ باپ کے ترکہ میں سے بیٹے کو تلوار کے سوا اور کچھ نہ ملتا تھا، اور کل مال و اسباب اور گھر بار بیٹی کے حصہ میں آتا تھا۔ بارے ایک مدت کے بعد اسلام کے عہد میں اسی تلوار کی بدولت ترکوں کے بخت خفتہ نے پھر کروٹ بدلی۔ اور سلجوقی خاندان میں ایک زبردست سلطنت کی بنیاد قائم ہو گئی۔ آخر ایک مدت کے بعد سلجوقیوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اور سلجوق کی اولاد جا بجا منتشر ہو گئی۔ انھیں میں سے ترسم خاں نام کے ایک امیر زادے نے سمرقند میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ مرزا کے دادا جو شاہ عالم کے زمانے میں سمرقند سے ہندوستان میں آئے، وہ اسی ترسم خاں کی اولاد میں تھے۔"

خواجہ الطاف حسین حالی نے یہ اطلاعات مہر نیم روز کے دیباچے اور درفش کاویانی میں غالب کے تحریروں سے اخذ کی ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

"مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی، اور ہندوستان کی زبان بہت

کم سمجھتے تھے۔ اس زمانے میں ذوالفقارالدولہ اور مرزا نجف خاں، شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے۔ نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوا دیا، اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ، ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کر دیا۔"

حالی کے اس بیان کا ماخذ بھی غالب کی ایک تحریر ہے، جو انھوں نے تذکرہ مظہر العجائب کے لیے صیغۂ متکلم کے بجائے صیغۂ غائب میں لکھا تھا۔ غالب کی شناخت کے ص ۶۱، ۶۲ پر غالب کی تحریر کا عکس ہے۔ کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

[illegible]

غالب کے بیان میں ایک غلطی ہے۔ غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب میں صفحہ تیرہ[۱۳] پر وضاحت کی ہے۔

"شاہ عالم کی بادشاہی کا زمانہ ۱۷۵۹ء سے شروع ہوتا ہے، اور چونکہ میر منو[1] کے پاس میرزا قوقان بیگ خاں لاہور میں ملازم رہے، ۱۷۵۰ء میں وفات پا چکے تھے، اس لیے ثابت ہوا کہ وہ شاہ عالم نہیں بلکہ اس سے پہلے محمد شاہ[2] کے عہد میں یہاں آئے"[3]

قوقان بیگ خاں کا سمرقند سے ہندوستان آنا ۱۷۵۰ء یا اس سے چند برس پہلے تسلیم کیا گیا ہے۔ اسے ماننے میں تردّد یوں ہے کہ کسی ملک میں مستحکم حکومت ہو تو تجارتی قافلے بھی باہر سے آتے ہیں۔ شعرا، ہنرمند، دستکار اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں کچھ خاندان بھی۔ ہندوستان میں شمالی سرحد سے باقاعدہ فوج کشی بھی ہوتی رہی، اور سرحدی علاقوں میں مغل بھی آتے رہے۔ شہزادہ محمد کے ساتھ امیر خسرو اور حسن سجزی بھی مغلوں کے ہاتھوں قید ہوئے تھے۔ شہزادہ قتل ہوا، خسرو اور حسن دلی واپس آئے۔ سرحدوں پر جاسوسوں کا ایک جال پھیلا ہوا تھا۔ پرچہ نویس مقرر تھے۔ قوقان بیگ خاں پچاس گھڑ سواروں کی، ہتھیاروں سے لیس ٹکڑی کے ساتھ نہیں پہنچ سکتے تھے، تاوقتیکہ وہ کسی لشکرِ جرار کا حصہ نہ ہوتے۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ دُرانی نے دلی پر حملہ کیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۴۶ء، ۱۷۶۱ء تک کئی بار ہندوستان پر چڑھائی کی۔ قوقان بیگ خاں کا پچاس سواروں (فوجیوں) کے ساتھ اس زمانے میں سمرقند سے آنا قرینِ قیاس نہیں ہے۔

اب اس منظر نامے پر غور کریں کہ قوقان بیگ خاں صرف ترکی جانتے تھے، تو ان کے ساتھ آنے والے ان کے پچاس ہم وطن بھی ترکی نژاد تھے، اور یہ پچاس سواروں کی ترکی بولنے والی پلٹن دلی آئی اور قوقان بیگ کی پلٹن کو ذوالفقار خاں اور مرزا نجف خاں نے شاہ عالم سے اپنی ملازمت دلوائی کہ نقارہ ونشان سے سرفراز ہوئے۔ ایک سیر حاصل پرگنہ پہاسو بھی ملا۔

مغلوں کے عہد میں منصب داری اور جاگیرداری کا ایک باقاعدہ نظام تھا۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر محمد اطہر علی نے "اورنگ زیب کے عہد میں مغل امرا" ایک تحقیقی مقالہ ڈاکٹر ستیش چندر کی

---

[1] نواب معین الملک۔ [2] رنگیلے۔ [3] بحوالہ ذکرِ غالب (مالک رام)

نگرانی میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ میں لکھا تھا، اور مشکل مقامات پر پروفیسر محمد حبیب نے ان کی رہنمائی کی تھی۔ بابر اور ہمایوں کے عہد کے بھی حوالے ہیں۔ اکبر کے زمانے میں تو ابوالفضل علامی نے آئین اکبری لکھی اور ایک نظام مرتب کیا گیا۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک، جس نے ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء تک حکومت کی۔ سارے حوالے ہیں، شرحیں ہیں۔ خاص طور سے شاہجہاں کے زمانے میں جو کٹوتیاں ہوئیں۔ اگرچہ جاگیروں کا نظام، کسانوں کے لیے بڑا سفاکانہ تھا، لیکن ایک نظام تھا، بدعنوانیوں سے بھرپور۔ یک صد اور نصف، صد تک کا منصب تھا۔ ذات اور منصب کے جدول تھے۔ سب کے نام لکھے جاتے تھے۔ یہ بھی لکھا جاتا تھا کہ کس منصب دار کو یک سپہ، دو سپہ یا تین سپہ کے زمرے میں رکھا گیا ہے۔ گھوڑوں پر داغ لگانا اور معائنے کے لئے منصب دار کو ایک چوتھائی تعداد گھوڑوں کی، سوار کے ساتھ پیش کرنا ضروری تھی، ورنہ جرمانہ ہوتا تھا۔ کٹوتیاں ہوتی تھیں۔ شہزادوں کو سال میں بارہ مہینے کی تنخواہ ملتی تھی۔ باقیوں کو چھ، سات، آٹھ، اور نو مہینے کی۔ مغلوں نے یہ طریقہ ایجاد نہیں کیا تھا۔ بلبن کے زمانے میں بھی تھا۔[1]

غالب اور ان کے خاندان پر، کتابوں سے کتابیں بن رہی ہیں۔ کسی دستاویز میں قوقان بیگ کا اندراج نہیں ہے۔ غالب کے سلسلے میں مالک رام نے ساری دستاویزیں کھنگال ڈالی ہیں۔

قوقان بیگ کے سلسلے میں کئی سوال پیدا ہوتے ہیں:۔

۱۔ قوقان بیگ خاں کے ساتھ جو پچاس سوار آئے تھے وہ سب مہم جو، نوجوان اور ایک ہی قبیلے کے ہوں گے۔

۲۔ اگر واقعتاً وہ سمرقند سے آئے، تو سب کنوارے ہی ہوں گے۔

۳۔ قوقان بیگ کی شادی کہاں، کس سے ہوئی۔ کسی معروف گھرانے میں شادی ہوتی تو کہیں اس کا ذکر ہوتا۔

---

[1] ضیاءالدین برنی نے اس کا ذکر تاریخ فیروز شاہی میں کیا ہے۔

۴۔ قوقابیگ خاں سلجوقی ابن ترسم خاں سلجوقی کی وفات کب اور کہاں ہوئی۔ وہ کہاں آسودۂ خاک ہیں۔ زمانہ وہ تھا، جب نوجوانی میں شادیاں اور اولادیں ہوتی تھیں۔ بچے دادا، پردادا نانا، پرنانا کو دیکھتے تھے۔ قوقان بیگ خاں کا ذکر غالب نے یا کسی اور نے ایک کردار کی طرح کیوں نہیں کیا؟ نانا کا نام بھی برسبیل تذکرہ کسی اور کہانی میں آیا ہے۔

۵۔ قوقان بیگ خاں کے چار بیٹے تھے اور تین بیٹیاں۔ غالب کے والد عبداللہ بیگ سب سے بڑے تھے۔ ان سے چھوٹے بھائیوں میں ایک نصراللہ بیگ تھے۔ دو کے نام غالب نے اپنے کسی خط میں بھی نہیں لکھے۔ کیوں؟ کیا وہ دو بھائی قوقان بیگ کی کسی اور بیوی کے بطن سے تھے؟ بڑے تھے یا چھوٹے؟

وفات سے ٹھیک دو برس پہلے یعنی ۱۵ فروری ۱۸۶۷ء کو غالب نے ایک خط میں اپنے شاگرد حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھا۔

"۔۔۔۔ میں قوم کا ترک سلجوقی ہوں۔ دادا میرا ماوراالنہر سے شاہ عالم کے وقت میں ہندوستان آیا۔ سلطنت ضعیف ہوگئی تھی۔ صرف پچاس گھوڑے، نقارہ نشان سے شاہ عالم کا نوکر ہوا۔ ایک پرگنہ سیر حاصل ذات کی تنخواہ اور رسالے کی تنخواہ میں پایا۔ بعد انتقال اس کے، جو طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم تھا، وہ علاقہ نہ رہا۔ باپ میرا عبداللہ بیگ خاں بہادر، لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا بعد چند روز حیدرآباد جاکر نواب نظام علی خاں کا نوکر ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا، کئی برس وہاں رہا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والد نے گھبرا کر الور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں کسی لڑائی میں مارا گیا۔ نصراللہ بیگ، خاں میرا چچا حقیقی مرہٹوں کی طرف سے اکبرآبادی صوبے دار تھا۔ اس نے مجھے پالا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا، صوبے داری کمشنری ہوگئی، اور کمشنر ایک انگریز مقرر ہوا۔ میرے چچا کو جرنیل لیک صاحب نے سواروں کی بھرتی کا حکم دیا۔ چار سو سواروں کا برگیڈیر ہوا۔ ایک ہزار سات سو روپے دو ماہہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر

عینِ حیات، علاوہ سال بھر مرزبانی کے تھی ۔۔۔۔"

مرزا ابو طالب اصفہانی کی کتاب تفضیح الغافلین کا ترجمہ تاریخ آصفی کے نام سے ڈاکٹر ثروت علی نے کیا ہے ۔ مرزا ابو طالب اپنے عہد کے عالموں میں سے تھے ۔ یورپ کے ملکوں کی بھی سیاحت کی تھی، اور اپنے سفرنامے لکھے ہیں ۔ اودھ کی حکومتوں سے بھی وابستہ رہے ۔ دیباچہ، مقدمہ، آغاز وقائع آصف الدولہ کے علاوہ سال بہ سال وقائع ١٧٧٥ء سے ١٧٨٢ء تک کے لکھے ہیں۔ اس کتاب میں صرف دو جملے ایک عبداللہ بیگ ترک کے بارے میں ہیں ۔ (ص ٨٩)

"اسی سال (١٧٨٠-١٧٨١) کرنل ہانی کو سردار کے علاقے سے معزول کر دیا گیا۔

اور عبداللہ بیگ ترک کو اس کی جگہ مقرر کیا گیا ، جو کمپنی کا ملازم تھا ۔"

یہ عبداللہ بیگ ترک ہونے کے باوجود غالب کے والد نہیں ہو سکتے ، کیونکہ وہ قوقان بیگ کے بیٹے سپاہی زادے تھے ۔ نظم و نسق کے ماہر نہیں اور پھر وہ کمپنی کے ملازم کب تھے ؟"

تین سو سواروں کی جمعیت سے اگر عبداللہ بیگ خاں حیدرآباد میں ملازم ہوئے ہوتے، تو ان کا شمار حیدرآباد کی نامور ہستیوں میں ہوتا ۔ ذکا جو غالب کے نیازمندوں میں سے تھے ۔ عبداللہ بیگ خاں کے بارے میں زمانۂ قیام حیدرآباد کے بارے میں غالب کو کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے اور غالب کے کسی خط میں اس کے بارے میں بھی کچھ ہوتا ۔ کم از کم غالب ہی ذکا کو لکھتے کہ والد کے حیدرآباد کے قیام کے حالات جمع کر کے لکھو۔

بے شک غالب اپنے عہد کی سب سے قدآور ادبی شخصیت ہیں لیکن ان کی سائیکی ایک بے سہارا، ڈرے اور سہمے ہوئے انسان کی ہے ۔ وہ ہمیشہ ایک شدید احساس کمتری کا شکار رہے ۔ اور اس کا اظہار جابجا ان کے خطوں میں، ان کے رویّوں میں اور ان کے شعروں تک میں ہے ۔ شعر میں تعلّی جائز ہے، لیکن ان کی تعلّیاں کچھ عجیب سی ہیں ۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری ہی ان کی نام آوری کا سبب ان کی زندگی میں بھی تھی، اور آج بھی ہے ۔ حالی نے یادگار میں کانٹے کی بات لکھی تھی :-

"اگرچہ مرزا کی تمام لائف میں کوئی بڑا کام ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا نظر نہیں آتا، مگر صرف اسی ایک کام نے اُن کی لائف کو دار الخلافہ کے اخیر دور کا ایک مہتم بالشان واقعہ بنا دیا ہے۔"

(دیباچہ یادگار: ص ۳)

۱۸۹۷ء، نامی پریس کانپور

اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں غالب کو شہرت کچھ زیادہ ہی ملی، اور اس کے لیے انھیں کچھ قربانی بھی دینا پڑی، اور وہ یہ کہ انھیں اسلوب کے سلسلے میں سمجھوتہ کرنا پڑا۔ یہ نہیں کہ شروع میں انھوں نے صرف اپنے شعر کہے، جن پر چیستاں بھبتی کسی جا سکے اور کسی بھی گئی (کلام میر سمجھے یا کلام میرزا سمجھے / مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے) اور جھلا کر انھوں نے کہا:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب کو زندگی بھر ستائش کی تمنا بھی رہی اور صلے کی پروا بھی۔ صلے کی آرزو نے اُن سے کیا کیا نہ کرایا، یہ دوسری کہانی ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جب وہ کلکتے گئے (۱۸۲۶ء) تو نہ صرف اپنے ساتھ اپنے اُردو دیوان کا ایک انتخاب لے گئے تھے، بلکہ اُردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب گُل رعنا کے نام سے کیا۔ اس انتخاب سے چند نمونے کے اشعار نقل کرنے سے پہلے دیباچے سے ایک اقتباس:۔

"۔۔۔۔ اما اکدش اختلاط ہندو آزادی، حیرانِ دوراہۂ اندوہ و شادی، جهان جهان رنج تن را مطلوب و عالم عالم درد دل را طالب محمد اسد اللہ تخلص، المنشائی، اکبرآبادی مولد، دہلی مسکن۔۔۔۔"

ایک نسخے میں نام محمد اسد اللہ خاں بھی ہے۔ خاں شاید جہان کے قافیے کے طور پر ہو۔ مقفیٰ نثر میں آزادی کا قافیہ شادی شروع ہی میں ہے۔ درد دل را طالب کی مناسبت محمد اسد اللہ خاں غالب شاید اس لیے نہیں ہے کہ افضل بیگ (اکبر شاہ کے کلکتہ میں وکیل) نے پہلے ہی ہنگامے کی سی صورت پیدا کر دی تھی، کہ یہ شخص جو پنشن میں اضافے کی درخواست لے کر آیا ہے،

اصلی مدعی نہیں، یہ تو خود کو غالب کہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خود کو سمرقندی شاید پہلی بار میرزا نے لکھا۔ اور گلِ رعنا، اگرچہ سراج الدین احمد کی فرمائش پر ترتیب دی گئی،

با سراج الدین احمد چارہ جز تسلیم نیست
ورنہ غالب میگزد شوقِ غزلخوانی مرا

دیباچہ میں یہ شعر غالب تخلص کے ساتھ موجود ہے، اور انتخاب (اُردو کلام) کا جو نسخہ وہ ساتھ لے گئے تھے، اس میں اسد اور غالب، دونوں مقطعوں میں ہیں، اور چونکہ اس دیوان پر ان کی مہر بھی تھی، اس لئے میرزا اپنی صفائی پیش کر سکے وہ واقعی عبداللہ بیگ خاں کے بیٹے اور نصراللہ بیگ خاں کے بھتیجے ہیں۔

گلِ رعنا کے آغاز میں نقش فریادی ہے الخ غزل کے تین شعر ہیں۔

دوسری غزل کا پہلا شعر ہے:

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا نہ سُود تھا

تیسری غزل میں چار شعر لے گئے ہیں، مطلع ہے

دوست غمخواری میں میری سعی فرماویں گے کیا
زخم کے بھرتے تلک ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا

چوتھی غزل میں دو شعر ہیں۔ دوسرا یہ ہے۔

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

پانچویں غزل سے چار شعر لئے گئے ہیں پہلا یہ ہے:

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، وہ پریشاں نکلا

ایک شعر بھی گنجلک نہیں ہے۔ مثلاً

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

یا　　مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

غزل کے سارے ۱۷ شعر شامل ہیں۔ صرف ایک بات عرض کرنا ہے۔ ۱۱۵ ویں غزل میں تیسرا شعر ہے۔

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
جز نالہ، نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

غالب کے دیوان میں جز نالہ نہیں اے نالہ ہے۔ اے نالہ کی وجہ سے شعر کی تفہیم مشکل ہو گئی۔ لیکن غالب کو اس پر اصرار رہا کہ شعر اے نالہ کے ساتھ پڑھا جائے، اور اے کی جگہ جز پڑھیں تو معنی واضح ہو جائیں گے۔ یادگار میں حالی نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

"میں نے خود اس شعر کے معنی مرزا سے پوچھے تھے۔ فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو، معنی خود سمجھ میں آجائیں گے۔" (یادگارِ غالب: ص ۱۱۴)

یادگار میں ص ۱۰۸ پر حالی نے لکھا ہے :-

"مرزا نے گلِ رعنا کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔۔۔" فٹ نوٹ میں کلیاتِ نثر فارسی میں اس دیباچے کے شامل ہونے کا ذکر ہے۔ شاید گلِ رعنا حالی کی نظر سے نہیں گزری تھی، ورنہ اے اور جز کی بحث سے کچھ اور استخراج بھی کرتے۔

غالب کی سائیکی کا زندگی میں بھی اور شعر کے فن میں بھی بہت بڑا رول ہے۔ خطوں سے واضح ہے کہ روشِ عام سے اُن کو چڑ تھی۔ داڑھی کے بال سفید ہونا شروع ہوئے (چیونٹی کے انڈے نظر آنے لگے)، تو انھوں نے داڑھی رکھ لی، لیکن اسی کے ساتھ سر کے بال بھی منڈوا دیے، کیونکہ سر پر بال اور گالوں پر داڑھی۔ یہ حلیہ اہلِ حرفہ کا تھا۔ دھنیے، جلاہے، نان بائی، نیچہ بند کے حلیے سے نواب اسد اللہ خاں غالب خود کو الگ رکھنا چاہتے تھے۔ وہ عوام میں شمار کیے جانے کو باعثِ ننگ سمجھتے تھے۔ یہ حلیہ صرف اہلِ حرفہ کا نہیں تھا، خود ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف اور شیخ محمد ابراہیم ذوق، امیر مینائی، اور بہادر شاہ ظفر کا

بھی تھا۔ یہ احساسِ کمتری تھا، جس نے غالبؔ کے قلم سے اہلِ حرفہ کو رذیلوں کے زمرے میں رکھا، اور اپنے اور ان کے درمیان حدِ فاصل اپنے سر کے بالوں کو بنایا، اور اس حدِ فاصل کو منڈوا دیا۔

آج ہم سب غالبؔ کی اس رباعی پر سر دھنتے ہیں، کہ انھوں نے کیسی درست بات کہی تھی۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے اسی سے اپنے مقالے "محاسنِ غالبؔ" کی تمہید اخذ کی۔

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودے
دیوان مرا شہرت پرویں بودے
غالبؔ اگر ایں فنِ سخن دیں بودے
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودے

جب یہ رباعی لکھی گئی تھی، تو اس کی پشت پر برتری حاصل کرنے کا وہ جذبہ تھا، جس کی نشو و نما احساسِ کمتری نے کی تھی۔

بادشاہ خود کو ظلِ الٰہی کہلواتے تھے DIVINE RIGHT OF KING کی بنیاد ہے۔ الہام/ آمد اور آورد کی بحث بہت پرانی ہے۔ اگر شعر، وحی کی طرح نازل ہوں تو شاعر داد کا خواہاں کیوں ہو۔ غالبؔ اپنے فن پر بھی ناز کرتے ہیں اور ایسی بات بھی کہتے ہیں کہ بلا اذن و ارادہ اور بلا خونِ جگر کے صرفے کے انھوں نے شاعری کی۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اور اس سے بھی ایک مرحلہ آگے:

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالبؔ
شعر خود خواہشِ آں کرد کہ گردد فنِ ما

غالب ہر نعمت کو، جس میں شاعری بھی ہے، اور ان کے اجداد بھی، فطرت کا، قدرت کا عطیہ سمجھتے ہوں یا نہ ہوں، بتلاتے ضرور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شعر بھی خود ان کی فکر کا نتیجہ ہیں، اور ان کا نسب نامہ بھی انھیں کی فکر کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے صرف اپنا استاد

یعنی اپنا معنوی جد، ملا عبد الصمد ہی نہیں، افراسیاب تک اپنا نسب نامہ (نامکمل ہی سہی) ایجاد کیا۔ اُن کی یہ شکایت بے جا ہے:-

شوق ساماں فضولی ہے، وگرنہ غالبؔ
ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

لوگ آج کے لیے، اور آنے والے کل کے لئے تمنا کرتے ہیں۔ غالبؔ نے اپنی پسند کے ماضی کے لئے تمنا کی۔ کیوں کی؟ اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کم از کم سمجھنے کی کوشش کیجا سکتی ہے۔

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

اور اس کا ردِّ عمل یہ ہے:-

تازہ دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعدِ من خواہد شدن

اور واقعی ایسا ہوا۔ غالبؔ کی شاعری کی قدر ان کے زمانے میں بھی کچھ کم نہیں ہوئی۔ لیکن بعد میں زیادہ ہوئی۔ زمانہ اور زمانہ کی روش سے زچ ہو کر وہ مستقبل میں اپنے کلام کی حکمرانی دیکھتے ہیں۔ یہ غالبؔ کی سائیکی ہے۔ مغلیہ سلطنت چراغِ سحری تھی، اس لیے انھوں نے مہرِ نیم روز میں جو سالہا انھیں دیا گیا تھا، اسے انشا تو کیا، لیکن اپنا نسب نامہ چغتائیوں سے نہیں، ان سے جوڑا جو روایت کا دستور تھے۔ انھوں نے اپنا سلسلہ افراسیاب سے جوڑا۔ افراسیاب ایک نہایت طاقتور کردار ہے، اور اگرچہ شکست کھاتا ہے، اور مارا جاتا ہے، لیکن ایران اور توران کی اساطیر اُس کے بغیر بے وجود ہو جاتی ہیں۔ سکندر زیادہ بڑا بادشاہ ہے، روایت اس کے بغیر بھی ادھوری ہے۔ لیکن افراسیاب سارے بادشاہوں پر حاوی ہے، روایت میں۔ شاہنامے میں فردوسی نے دعویٰ کیا ہے کہ اُس نے رستم کو رستم بنایا، لیکن افراسیاب کے بارے میں ایسی بات نہیں کہی۔ کیکاؤس تو کئی جگہ سادہ لوح نظر آتا ہے۔

افراسیاب نہیں۔

شاہ سمن گاہ کی بیٹی تہمینہ کے بطن سے رستم کا بیٹا سہراب پیدا ہوتا ہے، جو جوان ہونے کے بعد ایران پر حملہ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ اپنے باپ رستم کو بادشاہ بنائے۔ لیکن رستم سے مقابلہ ہوتا ہے۔ رستم، اس شرمندگی سے کہ ایک نوخیز جوان اس پر بھاری پڑ رہا ہے، اپنا نام نہیں بتاتا۔ اور مافوق الفطرت قوت کی مدد سے اس پر غالب آتا ہے، اور زخمی کر کے موت کے دہانے پر پہنچاتا ہے۔ مرنے سے پہلے سہراب جب اپنا رشتہ رستم سے بتاتا ہے تو رستم تریاک لینے کیکاؤس کے پاس جاتا ہے۔ مگر کیکاؤس تریاک نہیں دیتا، کیونکہ دشمن کو چاہے وہ رستم کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، زندہ رہنے دینا آئینِ جہاں بانی کے خلاف سمجھتا ہے۔

ایران کی اساطیر فردوسی کے شاہنامے کی وجہ سے غالب کے ذہن میں رچی بسی تھیں اور انھوں نے اپنے رول ماڈل کے طور پر افراسیاب کو شعوری یا غیر شعوری طور پر چنا تھا۔ فارسی شاعری اور وہ اساطیر جو فردوسی نے آبِ حیات سے شاہنامے میں شعر بند کر دیں۔ غالب کی ذہنی کائنات کی کہکشائیں بن گئیں۔ اساطیر سے اُن کی پیاس بجھی نہیں، دوچند ہو گئی۔ اساطیر سے دساتیر تک ایک لمبا سفر ہے۔ جسے انھوں نے ظلمات وجود میں آبِ حیات جانا۔ وہ ایک ایسا سراب ہے، کہ اس سے نظر ہٹاتے تو چشم بصیرت بے نور ہو جاتی۔ اساطیر اور دساتیر جاگتے میں سراب اور غنودگی میں خواب کی طرح غالب کی ذہنی ساخت میں جزوِ اعظم بن گئیں۔ پروفیسر نذیر احمد نے عمرِ عزیز کی ایک بڑا حصہ دساتیر اور غالب کی دساتیر پرستی پر صرف کیا ہے، اور کر رہے ہیں۔ دساتیر کو انھوں نے ایک جعلی کتاب ثابت کر دیا ہے، اور اس کی زبان کو بھی جعلی زبان قرار دیا ہے۔ ایک مخصوص گروہ کے لئے، جو کوڈ (code) سے واقف ہو ترسیل کا نظام (coded) ہو سکتا ہے، زبان جعلی نہیں ہو سکتی۔ الفاظ اور اُن کے معنی کو الگ الگ پرچیوں پر لکھ کے، دونوں ڈھیروں سے ایک ایک پرچی اُٹھا کر لفظ سے نئے معنی جوڑ دیں تو code نہ جاننے والے کے لئے زبان ناقابلِ فہم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ دساتیر کا بھی معاملہ ہے۔ لیکن غالب نے کہ دساتیر کی سوگند کھاتے تھے۔ اس حقیقت کو نہیں سمجھا۔

افراسیاب کو نہ صرف غالب نے اپنا جدِ امجد مانا، بلکہ داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا کے افراسیاب سے بھی انھوں نے ذہنی قربت محسوس کی۔ داستان میں بھی افراسیاب نہ صرف طلسم کا بادشاہ ہے، بلکہ سب سے زبردست کردار ہے، اور ساری داستانِ امیر حمزہ یا طلسم کشا کے گرد نہیں، افراسیاب کے گرد گھومتی ہے۔ عمرو (عُمَر / اَمَر) عیار بھی ان کے ذہن میں اسی داستانِ امیر حمزہ کی وجہ سے رچ بس گیا تھا۔

دُرِّ معنی ہے مرا صفحہ لقا کی داڑھی
غمِ گیتی ہے مرا صفحہ عمر(و) کی زنبیل

اس قطعے کے علاوہ بھی اس داستان کو انھوں نے ایک قصیدے کی تشبیب کے لیے چُنا۔ اور اس میں عمرو عیار ہی نہیں افراسیاب کا بھی ذکر ہے۔

غالب نے اگر اپنے جدِ امجد کو چُنا تو ہمیں اس کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے، اس پر معترض نہ ہونا چاہیے، کیونکہ انھوں نے تیر کو تراش کر قلم بنالیا۔ اسے انھوں نے قلم بنالیا۔

غالب بہ گہر ز دودۂ زادشم
زاں رو بصفائی دم تیغست دمم
چوں رفت سپیدی زدم چنگ بہ شعر
شد تیر شکستۂ نیاگانم قلمم

غالبؔ اور نوّابانِ لوہارو

غالبؔ کے قریب ترین رشتہ دار نوابانِ لوہارو تھے۔ ان کے بزرگوں کے تعلقات کبھی اس خاندان سے رہے تھے یا نہیں یہ تو نہیں کہا جا سکتا مگر غالبؔ کے اپنے تعلقات بچپن ہی سے اس خاندان کے ساتھ غیر معمولی تھے۔ نواب نصراللہ بیگ خاں (غالبؔ کے عمِ محترم) کی شادی اسی خاندان میں ہوئی تھی اور وہ نواب احمد بخش خاں کے بہنوئی تھے۔ نواب احمد بخش خاں اس خاندان کے بہت ممتاز فرد تھے۔ فخرالدولہ دلاور ملک رستم جنگ کے خطاب سے سرفراز تھے۔ لارڈ لیک بہادر سپہ سالارِ افواجِ انگلش سے نواب احمد بخش خاں کے بہت قریبی مراسم تھے۔ شمالی ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرتی ہوئی انگریزی افواج کی سربراہی لارڈ لیک کو حاصل تھی۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک کی کمانڈ میں انگریزی افواج نے دہلی پر قبضہ کیا۔ (جس کے کمان دار اس وقت جنرل آکٹر لونی تھے) تو دوسرے مقامی امراء اور علاقائی رؤسا میں نواب احمد بخش خاں بھی شامل تھے جو انگریزوں کے ساتھ آ گئے تھے۔

ان ہی نواب احمد بخش خاں نے نواب نصراللہ بیگ خاں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ کر (جن کی طرف سے وہ قلعہ اکبرآباد کے نائب قلعہ دار تھے) افواجِ انگلشیہ کے ساتھ آ جائیں۔ بقول غالبؔ صوبہ داری کمشنری میں بدل گئی اور لارڈ لیک نے نواب نصراللہ بیگ خاں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنا رسالہ قائم کریں جس کے نتیجہ

میں وہ چارسو سواروں اور سپاہیوں کے برگیڈیر بنائے گئے۔ پرگنہ پہاسو انھیں بطور جاگیر عطا ہوا نیز تنخواہ سے ممتاز کئے گئے۔

غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں ایک سپاہی پیشہ شخص تھے۔ انھوں نے مناسب ملازمت کی تلاش میں لکھنؤ، حیدرآباد اور جے پور کی طرف رخ کیا۔ حیدرآباد میں فی الجملہ اُن کی قدر افزائی ہوئی لیکن جلد ہی خانگی سیاست کے جھگڑے میں وہ ملازمت جاتی رہی۔ ان حالات میں عبداللہ بیگ خاں مہاراجہ الور کی طرف متوجہ ہوئے ابھی باقاعدہ ملازمت کی کوئی صورت نہیں بنی تھی۔ کہ کسی مقامی زمیندار نے بغاوت کی۔ اس کے خلاف جو مہم روانہ کی گئی، اس میں مرزا عبداللہ بیگ خاں بھی شریک تھے۔ راج گڑھ کے مقام پر باہمی مقابلے میں ان کو گولی لگی اور وہ وہیں جاں بحق ہوگئے۔

یہ راجہ بختاور سنگھ کا زمانہ تھا۔ مولانا حالی کا بیان ہے کہ مہاراجہ نے عبداللہ بیگ خاں کے پسماندگان کی پرورش کے لئے ایک گاؤں بر برحاصل مقرر کردیا، جس کا نام پالڑا تھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ 'مرقع الور' میں (جو تاریخ الور سے متعلق ایک اہم کتاب ہے۔) نہ عبداللہ بیگ خاں کا کہیں ذکر ہے' نہ اُن کے مارے جانے کا اور نہ ان کے بچوں کے لئے کسی گاؤں کے بطور پرورش دئے جانے کا۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ غالب ان کے چھوٹے بھائی اور ایک چھوٹی بہن اس وسیلۂ پرورش سے کب اور کیوں محروم کئے گئے۔ غالب نے مہاراجہ شیودھیان سنگھ کے لئے جو فارسی میں ایک قصیدہ لکھا ہے اس میں الور کے راج دربار سے اپنے دیرینہ تعلق کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر بھی رقم کیا ہے۔

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست

درخاکِ راج گڑھ پدرم را بود مزار

یعنی مشاہدہ کافی ہے اور کسی شہادت دینے والے کی ضرورت نہیں خاک راج گڑھ میں میرے باپ کے مزار ہی کو دیکھ لیا جائے۔

الور کے دربار سے نواب احمد بخش خاں کا تعلق کافی گہرا تھا۔ اور وہ مہاراجہ الور کے ایسے افراد میں سے تھے جن کو فی الجملہ معتمد علیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ عبداللہ بیگ خاں کی

وفات کے بعد غالب اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی پرورش نواب نصراللہ خاں نے اپنے ذمہ لے لی۔ ان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی۔ اس معنیٰ میں انھوں نے غالب کو اپنا بیٹا بنالیا تھا۔ بیگم نصراللہ خاں سے جو خاندانِ لوہارو کی دخترِ نیک اختر تھیں، غالب کے تعلقات کیسے تھے اس پر غالب نے کہیں کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ اب یہ سوئے اتفاق تھا کہ نواب نصراللہ بیگ خاں کا ہاتھی سے گر کر انتقال ہوگیا۔ وہ اس حادثہ میں شدید طور پر زخمی ہوئے اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان کی وفات کے بعد لارڈ لیک بہادر نے ان کے پسماندگان کے لئے پنشن مقرر کردی جن میں غالب بھی شامل تھے۔ ابتدا اس پنشن کی رقم دس ہزار روپیہ سال تھی۔ لیکن جلد ہی نواب احمد بخش خاں نے لارڈ لیک سے ایک ایسی دستاویز حاصل کرلی جس میں یہ رقم گھٹ کر پانچ ہزار روپیہ رہ گئی اور اس میں بھی غالب کا حصہ ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہوار قرار پایا۔ یہی دستاویز اور پنشن کی رقم غالب اور فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں کے مابین آگے چل کر اختلافات اور شکر رنجی کا سبب بنی۔

ابتدا میں یہ تعلقات کافی خوشگوار رہے ہوں گے اس لئے کہ ۱۸۱۰ء میں غالب کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی چھوٹی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ اس وقت غالب کی عمر صرف تیرہ برس تھی اور ان کی بیگم کی عمر صرف بارہ برس۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو مرزا دولہا کہا جاتا تھا اور مرزا غالب شادی کے بعد مرزا نوشہ کہلائے۔

اس وقت تک مرزا نصراللہ بیگ کے انتقال پر چار برس بیت چکے تھے۔ غالب اپنا زیادہ وقت اپنی ننھیال میں صرف کرتے تھے جو اکبرآباد ہی میں تھی۔ غالب کی اپنی پیدائش بھی اُن کے بیان کے مطابق اکبرآباد ہی میں ہوئی تھی، جبکہ اُن کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔

غالب کے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان اکبرآباد کے معزز شہریوں میں سے تھے۔ اور ایک صاحبِ املاک شخص تھے۔ غالب نے اپنے خطوط میں اپنے بچپن کے حالات پر جو روشنی ڈالی ہے ان سے واضح ہوتا ہے کہ اپنے نانا کی سرپرستی میں ان کی نوعمری کا زمانہ

کافی آرام و راحت سے گذرا۔

غالبؔ اپنے نانا یا ماں کے انتقال کے بعد وہ آگرے کی سکونت ترک کر کے مستقل طور پر دہلی آگئے۔ ممکن ہے یہاں کوئی اُن کا آبائی مکان بھی ہو۔ لیکن غالبؔ نے اپنے خطوط میں ایسے کسی خاندانی مکان کی موجودگی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ وہ یہاں ہمیشہ کرایہ کے مکانوں میں رہے۔ نواب الٰہی بخش خاں معروف کی حویلی وہ تھی جہاں آجکل رابعہ گرلز اسکول ہے۔ قریب ہی وہ بالائی منزل بھی تھی جہاں کبھی نواب ضیاء الدین احمد خاں کی نشست تھی۔

فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بیگم غالبؔ کے چچا ہونے کی وجہ سے اب غالبؔ کے عمِ محترم ہو گئے تھے۔ ان کو پنشن بھی نواب احمد بخش خاں کی جاگیر فیروز پور جھرکہ اور لوہارو سے ملتی تھی۔ لوہارو کے پرگنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نواب احمد بخش خاں نے خود ہی خریدا تھا۔

ابتداً دہلی میں غالبؔ کی زندگی عیش و آرام سے گزری۔ لیکن وہ بہت شاہ خرچ آدمی تھے، اپنی آمدنی سے کہیں زیادہ خرچ کرتے تھے۔ نتیجہ میں مقروض ہوتے چلے گئے نواب الٰہی بخش خاں معروف بھی اپنی طرف سے اگر غالبؔ کی مالی سرپرستی فرماتے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ غالبؔ نے اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ نواب صاحب کی وفات پا جانے کے بعد یہ کہیئے کہ غالبؔ کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوا۔ قرض خواہوں کی غوغا اور ہنگامہ آرائیوں سے وہ بہت پریشان ہوئے اس وقت ان کے دوستوں نے یہ مشورہ دیا کہ ان کی پنشن کی رقم میں دوسری دستاویز کے ذریعہ جو تخفیف عمل میں آئی ہے، وہ سر تا سر ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ اس مسئلہ پر فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں سے اگر رجوع کریں اور اپنی مشکلات ان کے سامنے رکھیں تو یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ نواب صاحب ان کی مشکلات اور پنشن کی رقم کے مسئلے پر دوبارہ غور کریں، اور کوئی ایسی صورت پیدا ہو جس سے ان کی حق تلفیوں کی تلافی ہو سکے۔

غالبؔ یہ ہی اُمید لے کر نواب صاحب سے ملاقات کے لئے فیروز پور جانا چاہتے تھے مگر نواب صاحب اس وقت ان انگریزی افواج کے ساتھ تھے جو قلعہ بھرت پور کا محاصرہ

کیے ہوئے تھیں۔ غالبؔ کو بھی بھرت پور کی طرف رخ کرنا پڑا۔ اس سفر میں ان کے برادرِ نسبتی علی بخش رنجورؔ بھی ان کے ساتھ تھے۔ غالبؔ اور رنجورؔ ایک ہی خیمہ میں رہتے تھے۔ خود ان کا فوجی سرگرمیوں سے کوئی رشتہ نہیں تھا، لیکن نواب صاحب کی وجہ سے یہ بھی وہاں کیمپ لائف گزارتے رہے۔

اسی زمانہ میں غالبؔ نے علی بخش رنجورؔ کو فارسی زبان اور ادبیات کی تعلیم دینے کے لئے قادر نامہ بھی تصنیف کیا۔ 'پنج آہنگ' میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اگرچہ 'پنج آہنگ' میں شامل خطوط اور بعض دوسری تحریریں کافی بعد کے اضافے ہیں لیکن پنج آہنگ کی داغ بیل غالبؔ کی قیام بھرت پور سے ہی پڑ چکی تھی۔

قیام بھرت پور کے زمانہ میں غالبؔ نے اپنے دوستوں کے مشورہ اور اپنی ضرورت وخواہش کے مطابق نواب صاحب سے ملنے اور عرض معروض کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن نواب صاحب نے ان سے نہ کوئی خاص وعدہ کیا اور نہ اُمید افزا باتیں کیں بلکہ مسائل ومعاملات کو آئندہ ملاقاتوں سے وابستہ کر دیا اس سلسلہ میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ انہوں نے سرچارلس مٹکاف سے ملنے اور ان سے اس خاص معاملہ میں مدد اور مشورہ کی ضرورت پر زور دیا۔ جو ایک ٹالنے والی بات تھی۔

غالبؔ وہاں سے فیروز پور جھرکہ آئے اور کچھ زمانہ تک وہاں قیام کیا۔ نواب صاحب فیروز پور جھرکا واپس تشریف لائے مگر بھرت پور کے معرکہ میں ان کو زخم آگئے تھے۔ صحت بہت خراب تھی۔ انہوں نے کسی کسی وقت اس کا بھی اظہار کیا کہ ان کے زخم ٹھیک ہو جائیں گے۔ صحت بحال ہو جائے گی تو کچھ سوچیں گے اور ان کے لئے کچھ کرینگے غالبؔ نے اس زمانہ میں علی بخش رنجورؔ کو جو خط لکھے ہیں ان سے اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ نواب صاحب کے رویہ سے مطمئن نہیں ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ نواب صاحب سے انھیں انصاف نہیں مل سکے گا۔

مولوی فضلِ حق خیر آبادی اور اپنے دوست رائے چھجومل کو انہوں نے فارسی میں جو خط بھیجے ہیں ان سے بھی اس ذہنی کشمکش کا پتہ چلتا ہے جس سے غالبؔ اس وقت

گذر رہے ہیں۔

وہ فیروز پور سے لوہارو بھی آئے اور یہاں کے زمانۂ قیام میں علی بخش رنجور کو جو خط لکھا اور میر امام علی نامی کسی شخص کے ذریعہ بھیجا اس سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے کہ ان کا ذہن صورت حال کو غیر اطمینان بخش تصور کر رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے۔

"کہ میر امام علی میرے خط کے ساتھ پہنچ رہے ہیں" جو نواب صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ کے طور پر بھیجا جا رہا ہے، تم میرے اس عرض نامہ کی پیروی کرنا اور نواب صاحب سے میرے حق میں سفارش کرنا اور اس میں کوئی محابہ نہ اختیار کرنا تاکہ نواب صاحب سے تم اپنی سعی و سفارش کے ذریعہ میرا حق دلا سکو۔"

غالب کی فیروز پور جھرکا یا لوہارو میں قیام کے دوران کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی وہ وہاں سے ناکام اور نامراد واپس لوٹے یہ واپسی کا سفر ان کے لئے حد بھر تکلیف دہ تھا۔ دہلی وہ جاتے تو کیسے جاتے۔ قرض خواہوں کی دار وگیر سے بچ کر تو وہ یہاں فیروز پور جھرکا آئے تھے نواب صاحب چونکہ بھرت پور تھے اس لئے پہلے بھرت پور میں رہے، پھر فیروز پور جھرکا میں قیام کیا لوہارو میں ٹھہرے۔ اب وہ صورت تھی کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ انہوں نے اپنی ایک عرضداشت میں اس کا اظہار کیا ہے کہ وہ قرض خواہوں کی گیر و دار سے خوف زدہ ہونے کے باعث واپس دہلی جانا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ دنوں انھوں نے پانی پت میں ضرور قیام کرنا پسند کیا تھا۔ یہ مدت کتنی ہے اور پانی پت میں وہ کس کے یہاں ٹھہرے اس سے متعلق ان کی کسی تحریر سے ہمیں کوئی روشنی بہم نہیں پہنچتی۔ لیکن پانی پت میں ان کے قیام کا ثبوت اس امر سے فراہم ہوتا ہے کہ انھوں نے شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کے آدمی قاسم علی خاں سے یہیں پانی پت میں ملاقات کی تھی۔ اس کا ذکر سلیمان شکوہ بہادر کو بھیجی جانے والی ایک عرضداشت میں موجود ہے۔ اس وقت تک پانی پت کے لوگوں سے ان کے تعلقات زیادہ استوار نہیں تھے۔ نہیں تو ان کے کسی میزبان کا ذکر ضرور آتا۔ مولانا حالی، میرن صاحب، سرفراز حسین وغیرہ

سے ان کے روابط بعد کے زمانے میں استوار ہوئے۔ اور پانی پت سے وہ براہ راست کانپور گئے، کچھ تو دور دراز سفر کی تکان اور کچھ محرومی اور مایوسی کے نفسیاتی اثرات کے نتیجہ میں غالب کانپور پہنچ کر بیمار ہوگئے اور قدرِ افاقہ ہُوا تو لکھنؤ پہنچے۔ انہوں نے اپنی ایک خاص غزل میں یہ کہا ہے ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھُلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشہ سو وہ کم ہے ہم کو

غالب کے لئے یہ بہت مشکلات کا دور تھا۔ فیروز پور جھرکا کی طرف سے محرومیوں کے احساس کے ساتھ واپسی کے علاوہ خود لکھنؤ میں بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا۔ اس زمانہ میں انھوں نے مولوی فضل حق اور رائے چھج مل کو جو خطوط لکھے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ محرومیوں اور ناکامیوں کے کن احساسات میں گھرے ہوئے ہیں۔ صنعت تعطیل میں لکھی ہوئی ان کی ایک تحریر جو مولوی فضل حق خیرآبادی کو بھیجی گئی اور اس معذرت نامہ کے طور پر بھیجی گئی کہ غالب دلی سے روانہ ہونے سے پیشتر جب وہ بھرت پور یا فیروز پور جھرکا کے لئے آمادۂ سفر تھے۔ مولانا سے رخصتی ملاقات کرنے کے لئے نہیں جاسکے وجہ طرح طرح کی پریشانیاں تھیں جو ان کے دل و دماغ کو گھیرے ہوئے تھیں۔

انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر جو قصیدہ کہا اور رئیس لکھنؤ کو پیش کرنے کی غرض سے ترتیب دیا اس کی تمہید اپنے فکری پس منظر کے اعتبار سے فیروز پور جھرکا سے ان کی ناکام واپسی کی یاد دلاتی ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے ؎

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

دوست کے دروازے سے میں کیا بتلاؤں کہ میں کس طرح واپس لوٹا۔ میں سراپا شوق یہاں آیا تھا اور مجسم حرماں بن کر واپس لوٹا۔ غالب کو لکھنؤ میں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی کہانی بھی فیروز پور جھرکا سے مختلف نہیں رہی۔ اگر غالب کے خطوط کی روشنی میں اس قصیدے کے تمہیدی حصے کو ملاحظہ کیا جائے تو اس نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ غالب

کی محرومی اور نامرادی کا سلسلہ سفر فیروز پور جھرکا ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ اس سلسلے کے مزید تین چار شعر یہ ہیں۔

ذوق غم حوصلۂ لذت آزام داد
پائے کوباں بسرِ خارِ مغیلاں رفتم
پائے پُرآبلہ ذوقِ سفر افزود مرا
راہ پیدائے بلا از بنِ دنداں رفتم
حال من بنگر و از عاقبت کار مپرس
عمرِ خود گشتم و در غصہ بپایاں رفتم
بسکہ تاریکی شبہائے جدائی دیدم
سایہ گردیدم و بے خود ز شبستاں رفتم

غالب نے اپنے ایک سے زیادہ خطوط میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ میں فیروز پور جھرکا اس لئے نہیں آیا تھا کہ میں یہاں سے ناکام و نامراد لوٹ جاؤں اور اس کی طرف بطور خاص انھوں نے اپنے برادر نسبتی علی بخش خاں رنجورؔ کے نام اپنے خطوط میں کیا ہے۔ رائے چھج مل کے نام جو خطوط لکھے گئے ہیں۔ ان میں بھی ان نامرادیوں اور محرومیوں کا تذکرہ آیا ہے۔

غالب فیروز پور جھرکا سے واپسی پر دلی گئے ہوں یا نہ گئے ہوں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے کلکتہ کے سفر کی صعوبتیں اور مشکلات برداشت کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ نہ اُن کی صحت اس کی اجازت دے رہی تھی اور نہ اُن کے مالی حالات اس کے حق میں کسی فیصلہ پر پہنچنے میں معاون ہوسکتے تھے کہ وہ اپنے مقدمے کی کار برآری کے لئے کلکتہ جیسے دُور دراز مقامات کا سفر اختیار کریں۔

لکھنؤ سے وہ دوبار کانپور آئے وہاں سے باندہ کی طرف آگے بڑھے۔ چلا تارا، مودھا اور فتحپور سے ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے۔ باندہ میں رہتے ہوئے انھوں نے نواب ذوالفقار علی خاں رئیس باندہ سے قرض لیا۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ غالب نے یہ جرأت مندانہ

قدم اٹھایا لیکن اپنے پنشن کے مقدمے کی اس حیثیت پر غور نہیں کیا (یا انھیں کسی نے مشورہ نہیں دیا) کہ اس مقدمہ کا دہلی ریزیڈنسی میں پیش ہونا ضروری ہے اور اس کے بارے میں کسی فیصلہ کی مجاز گورنر جنرل کی کونسل کے اراکین ابتدائی مراحل میں ہو نہیں سکتے۔ یہ بات غالبؔ کے ذہن میں رہی تھی مگر وہ یہ سمجھتے رہے کہ جب ان کا معاملہ گورنر یا نظمائے کونسل کے سامنے جائے گا تو ضرور وہ اپنا جائز حق نواب احمد بخش خاں سے لے سکیں گے۔

ابھی وہ کلکتہ پہنچے بھی نہ تھے، کہ فضل مولا خاں نامی شخص نے انھیں یہ اطلاع دی کہ نواب احمد بخش کا انتقال ہوگیا ہے۔ غالبؔ نے اس پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا کہ اس خاندان کا ایک ممتاز اور منفرد کردار رکھنے والا شخص اس جہاں سے اُٹھ گیا، اور ایک معنیٰ میں اس کے سر سے چادر اُتر گئی۔ انھوں نے علی بخش رنجور کو جو خط لکھا اس میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت تک لوہارو خاندان کی عظمتوں کا مدار فخر الدولہ دلاورالملک نواب احمد بخش خاں رستم جنگ ہی کی ذات والا صفات تھی۔ حکام بالا اور پھر خاص طور سے انگریزی افسران سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے اور اسی تعلقات کی وجہ سے لارڈ لیک نے ان کی فرمائش پر پنشن کی دستاویز بدل ڈالی تھی اور وظیفہ کی رقم گھٹ کر نصف رہ گئی تھی اور ان میں غیر متعلق افراد کو شامل کر لیا گیا تھا۔

نواب احمد بخش خاں نے اپنی موت سے پہلے نواب شمس الدین احمد خاں کو اپنا وارث و جانشیں مقرر کر دیا تھا۔ وہ نواب صاحب کے بڑے بیٹے تھے، لیکن کسی خاندانی عورت کے بطن سے نہیں تھے۔ ان کی ماں مدّی بیگم کہلاتی تھیں اور نسلاً میواتن تھیں، جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ان کے بڑے بھائی امین الدین احمد خاں ایک خاندانی عورت کی اولاد میں سے تھے جو نواب صاحب کی دوسری عورت کے بطن سے تھے۔ جانشینی کا فیصلہ نواب شمس الدین احمد خاں کے حق میں ہوا۔ غالب اور ان کے درمیان شاید کبھی بھی اچھے تعلقات نہیں رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں نواب صاحب کے بعد لوہارو کے امیر بنائے

گئے۔ نواب شمس الدین احمد خاں کی مسند نشینی کے بعد غالب مزید اپنے پنشن کے معاملے کو اُلجھا ہوا محسوس کرنے لگے چونکہ شمس الدین احمد خاں دہلی کے بااثر امراء میں سے تھے اور انگریز حکام سے ان کے تعلقات غالب کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ غالب نے اس کا ذکر بھی اپنے ایک خط میں کیا ہے کہ میں تو ایسا شخص ہوں جس کا ہاتھ بھی نارسا ہے اور جس کی قسمت بھی اس نارسائی میں شریک ہے، جبکہ میرا دشمن ایک بااثر شخص ہے اور حکام سے اس نے دوستانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔

کلکتہ میں رہتے ہوئے شروع شروع میں انگریز حکام کا رویہ ان کے ساتھ بہت دوستانہ رہا خاص طور پر مسٹر انڈریو اسٹرلنگ اور مسٹر فریزر اور جارج سونوٹن بہادر ان انگریز افسران میں سے تھے جو ان سے ہمدردانہ اور مخلصانہ پیش آتے تھے، اور عطر و پان سے ان کی تواضع کرتے تھے۔ لیکن جلد ہی ان کو یہ معلوم ہو گیا اور اس سے وہ پریشان بہت ہوئے کہ اس مقدمے کی کارروائی یا اس کی سنوائی کے لیے عدالت مجاز دہلی ریزیڈنسی ہے اور اس مقدمہ کی پیش رفت کے لئے دہلی ہی کی عدالت سے رجوع کرنا ہوگا۔

جب تک غالب کو یہ خیال تھا کہ وہ یہ مقدمہ جیت جائیں گے اس وقت تک وہ اس طرح بھی سوچتے تھے کہ نواب احمد بخش خاں سے مقدمہ جیت کر ان کو جو خوشی ہوتی وہ اب نہیں ہوگی کیونکہ اس بادۂ خاص میں اصل مجرم تو نواب صاحب ہی تھے جنھیں غالب نے غاصب قومی کہنے میں بھی کوئی تکلف نہیں کیا۔ یہ اس شکر رنجی کی طرف اشارہ کرنے والا لفظ ہے جو مرزا غالب اور نواب احمد بخش خاں کے مابین قائم تھی، اور جس کا واشگاف اظہار بھی غالب کی زبان سے کبھی کبھی ہو جاتا تھا۔

انھوں نے دہلی میں رائے چھج مل کے توسط سے اپنا وکیل مقرر کیا، تمام ضروری کاغذات دہلی بھیج دیے ادھر ادھر سے سعی و سفارش کے طور پر خط بھی لکھوائے۔ اس وقت دہلی کے صاحب ریزیڈنٹ بہادر سر فرانیس ہاکنس تھے۔ انھوں نے غالب کے خلاف رپورٹ دی اور غالب کی تمام توقعات پر پانی پھیر دیا۔

غالب کے خود بھی بعض انگریزوں سے تعلقات تھے ان میں ولیم فریزر بھی شامل

تھے جو اس زمانے میں دہلی کے ریزیڈنٹ تھے۔ جب نواب شمس الدین احمد خاں اور ان کے بھائیوں اور نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے مابین اس معاملہ میں کشمکش تھی کہ نواب شمس الدین احمد خاں یہ کہتے تھے کہ میں مرحوم نواب احمد بخش خاں کا بڑا بیٹا ہونے کے رشتے سے ان کا وارث و جانشیں ہوں تو لوہارو کا پرگنہ بھی ان ہی کی تحویل میں آنا چاہیئے۔ ان کے بھائیوں کو وظیفہ مل سکتا ہے لیکن وہ رئیسِ لوہارو نہیں بنائے جا سکتے۔

اس خاص معاملے میں ولیم فریزر نے نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کا ساتھ دیا، اور لوہارو نواب شمس الدین احمد خاں کی مرضی کے خلاف ان دو بھائیوں کو مل گیا۔ یہی بات شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان وجہ اختلاف بن گئی اور ولیم فریزر قتل کرا دیا گیا۔

غالب انگریز افسروں سے ملتے رہتے تھے۔ ولیم فریزر کے قتل کے بعد اہلِ دہلی کا یہ خیال بھی تھا کہ اس سلسلے میں نواب شمس الدین احمد خاں کا نام غالب نے انگریزی حکام کے گوش ہوش تک پہنچایا۔ کچھ ہی وقت کے بعد یہ گتھی کھل گئی وہ بندوق بھی مل گئی جس سے ولیم فریزر کو گولی ماری گئی تھی اور فریزر کے قاتلوں میں سے ایک شخص سرکاری گواہ بن گیا۔ نواب شمس الدین احمد خاں گرفتار ہوئے۔ الہ آباد کے حاکموں میں سے ایک حاکم اس سنگین معاملے کی تفتیش پر مقرر ہوا اور اس کی طرف سے رپورٹ آنے پر نواب شمس الدین احمد خاں کو کشمیری گیٹ کے قریبی میدان میں سب کے سامنے پھانسی دیدی گئی۔ اس وقت دس ہزار کے قریب فوجی سپاہی اس قتل گاہ میں موجود تھے تاکہ کسی طرح کا بلوا نہ ہو جائے اور دہلی کو ایک نئی مشکل سے گزرنا نہ پڑے۔ غالب نے شیخ امام بخش کے نام اپنے فارسی میں لکھے گئے کئی خطوں میں اس حادثہ کی اطلاع دی ہے اور ولیم فریزر کے قتل سے لے کر نواب صاحب کی گرفتاری اور پھانسی دینے کے واقعات تک کی بعض تفصیلات پیش کی ہیں۔ نواب شمس الدین احمد خاں کی لاش پھانسی پانے کے بعد قبلہ رخ ہو گئی تھی اس سے اس عبرتناک منظر دیکھنے والوں کے ذہن میں یہ بات بھی آئی

کہ نواب صاحب کو بے قصور پھانسی پر لٹکایا گیا ہے۔ دہلی کے جو لوگ انگریزوں سے
نفرت کرتے تھے اور غالب کے بارے میں جن کو یہ خیال تھا کہ انہوں نے مخبری کی ہے
وہ مرزا غالب کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ کہتے نظر آتے تھے۔

اگرچہ رفتہ رفتہ غالب دوسرے مسائل میں تو گھرے رہے مگر اس خاص معاملے کو
لے کر اہلِ دہلی نے ان کے خلاف کوئی مہم نہیں چلائی ۔۔۔ نواب شمس الدین کے
بعد ریاست ضبط ہوگئی اور لوہارو سے متعلق نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین
احمد خاں کے حقوقِ ریاست خطرے میں پڑ گئے۔

غالب نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج الدین احمد کو نواب امین الدین احمد خاں
کے لئے ایک خط لکھا ہے کہ یہ کلکتہ پہنچ رہے ہیں اور میں دہلی میں ہوں۔ مروت اور
محبت کا تقاضہ تھا کہ میں اس وقت ان کے ساتھ ہوتا اور اس مشکل وقت میں اپنے
اس ناز پروردہ بھائی کو تن تنہا کلکتے کے سفر پر نہ جانے دیتا۔ اب آپ میری جگہ ان کو
اپنی مہمان نوازی اور خاطر و مدارات کے معاملے میں خصوصی توجہ کا مستحق سمجھیں اور کوشش
کریں کہ انھیں وہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ نواب امین الدین احمد خاں نے کلکتہ کا یہ سفر
۱۸۳۶ کے قریب کیا تھا، جب وہ اپنی ریاست لوہارو کے لئے کلکتہ کے حکام بالا سے
مل کر معاملات کو طے کرنا چاہتے تھے۔

غالب کو پنشن بھی جب تک ریاست باقی رہی، اسی کے خزانے سے ملتی رہی۔
اب فیروز پور جھرکا کی ضبطی کے بعد وہ سرکاری خزانے سے ملنے لگی۔ لوہارو کی جاگیر بھی نواب
امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو بطور ریاست واپس مل گئی۔ دلچسپ
بات یہ ہے اور بے حد قابلِ غور کہ غالب جو نواب احمد بخش خاں کو "غاصب قوی"
تصور کرتے تھے، وہ امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کے بہت قریب تھے۔
اور نواب صاحب کا رویہ جانبین کے باہمی تعلقات اور آپسی معاملات میں کبھی کسی کشمکش
کا باعث نہیں بنا۔ ممکن ہے یہ دونوں بھی اپنے والد کی خاندانی معاملات میں طرز و روش
سے خوش نہ ہوں لیکن اس پر کہیں اور کسی تحریر سے روشنی نہیں پڑتی۔

نواب امین الدین خاں سے غالبؔ کے تعلقات بہت شکستہ رہے لیکن ضیاء الدین احمد خاں نیرؔ رخشاں ان کے شاگرد تھے اور اپنے ایک عزیز اور صاحب صلاحیت شخص تھے، بلکہ اپنے ایک اُستاد کے رشتے سے غالبؔ کو بہت مانتے تھے۔ غالبؔ نے ایک سے زیادہ موقعوں پر اس کا اظہار کیا ہے کہ ان کی نگارشات اور کلام کبھی ان کے پاس نہیں رہا۔ حسین مرزا اور ضیاء الدین احمد خاں ان سے لے لے کر اپنے پاس غالبؔ کی تحریروں کو جمع رکھتے تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں ان کے گھر لُٹ گئے۔ ہزارہا روپے کی مالیت کے کتب خانے برباد ہو گئے تو ان کے ساتھ غالبؔ کا کلام اور ذخیرۂ نگارشات بھی غائب ہو گیا۔

غالبؔ نے نیرؔ رخشاں کے لئے جگہ جگہ تعریفی کلمات لکھے ہیں، اور ان کو اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے۔ غالبؔ اپنے عقائد کے لحاظ سے اثنا عشری تھے یعنی فرقہ امامیہ سے ذہنی طور پر ایک قریب تر شخص تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اہلِ تشریح نے یہ چاہا کہ ان کی آخری رسومات شیعی عقائد کے مطابق ادا کی جائیں لیکن نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ غالبؔ کی تدفین بھی دہلی میں بستی حضرت نظام الدین میں واقع نواب صاحب کے خاندانی قبرستان میں ہوئی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اپنی چچازاد بہن بیگم غالبؔ کے ساتھ بھی ہمیشہ اچھا برتاؤ کیا اور غالبؔ کے انتقال کے بعد ان کی خبرگیری میں نواب صاحب کا بھی ہاتھ رہا۔ ایک بار جبکہ غالبؔ دہلی سے ترکِ سکونت کر کے یہ چاہتے تھے کہ پٹیالہ جا کر بس جائیں اُس وقت یہ تجویز سامنے آئی تھی کہ بیگم غالبؔ یہیں دہلی میں رہیں گی اور ان کو لوہارو سے پچاس روپے ماہوار وثیقہ ملے گا۔

نواب صاحب کی دختر نیک اختر معظم زمانی بیگم عرف بگہ بیگم باقر علی خاں کاملؔ کی دلہن بن کر جب دہلی آئیں تھیں تو غالبؔ ہی کے ساتھ وہ گھر کی بہو کی حیثیت سے رہی تھیں باقر علی خاں اور حسین علی خاں نواب زین العابدین خاں عارفؔ کے بیٹے تھے۔ عارفؔ کی بے وقت وفات کے بعد غالبؔ ہی نے ان کی پرورش کی تھی۔ وہ ان دونوں کو اپنا بیٹا کہتے تھے جو بیگم غالبؔ امراؤ بیگم کے سگے بھانجے کے بیٹے تھے۔

نوابان لوہارو کے ساتھ غالب کے تعلقات ہمیشہ شگفتہ رہے۔ علاؤالدین احمد خاں جو نواب امین احمد خاں کے فرزند ارجمند تھے وہ غالب کو اپنا دادا کہا کرتے تھے۔ مگر غالب ان سے بے تکلف تھے، اور یہ لکھتے تھے کہ میں تمہارا دادا نہیں دلدادا ہوں۔ ان ہی کے نام غالب نے اپنا وہ مشہور خط تحریر کیا تھا۔ جو اُردو میں تمثیل نگاری کی ایک بہت خوبصورت اور دل آویز مثال ہے۔

سنو عالم دو ہیں ایک عالم اَرواح اور دوسرے عالم اجسام ہرچند قاعدہ عام یہ ہے کہ عالم اجسام کے گنہ گاروں کو عالم افراد میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ لیکن میرے معاملے میں اُلٹا ہوا ہے۔ مجھے کہ عالم ارواح کا گنہ گار ہوں۔ عالم آب و گل میں بھیج کر سزا دی گئی اور اس میں اپنی زندگی کو غالب نے قید کے استعارہ سے پیش کیا ہے دہلی شہر کو میرے لئے زندان مقرر کیا گیا اور نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ ان کی شادی تیرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی، اس کے لئے لکھا کہ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ یہ گویا ان کی وہ عمر ہے جو کنوارپن میں بسر ہوئی۔ اپنی بیگم کو وہ اپنے پیروں کی بیڑیاں کہتے تھے۔ بلاد شرقیہ کے سفر کا ذکر کر کے پھر کہتے ہیں، کہ جب یہ دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے تو دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دی گئیں۔ یہ گویا وہ دونوں بچے تھے جو ان کے زیر پرورش آگئے تھے۔

غرضکہ غالب کی خاندانی پینشن سے متعلق مقدمے کی پیچیدگیاں بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کی زندگی میں رشتے داری اور اس کی خوشگواری کے بہت سے پہلو بھی اسی خاندان کے افراد سے تعلقات کا خوشگوار ثمرہ تھے۔

ڈاکٹر محمد ایوب خان

خاندانِ لوہارُو اور ریاستِ فیروز پور جھرکا

سرزمینِ ہند پر خاندانِ لوہارُو کی ابتدا ر نواب قاسم جان، عارف جان اور عالم جان کی آمد سے ہوتی ہے۔ ان کے جدِ اعلیٰ خواجہ احمد لیسوی علوی تھے، جن کی وفات ۵۲۴ھ میں ہوئی۔ وہ باب ارسلان ترکستان کے مشہور ولی اللہ حضرت علیؓ کے چھوٹے صاحبزادے کی اولاد سے تھے۔ ان کی آئندہ نسل خواجہ محمد امین سے آگے بڑھی جو مشرقی ترکستان یارقند کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک معلّم تھے اور امیرِ بخارا امیر معصوم کے اُستاد تھے۔ ان کے فرزند خواجہ رحمت اللہ کو شاہی خاندان کا قرب حاصل تھا جس کی بدولت ان کا لقب تورہ تھا۔ وہ اپنے والد کے ہمراہ بخارا گئے جہاں پر ان کا انتقال ہُوا۔ بیٹے کی موت کے بعد خواجہ محمد امین دوبارہ یارقند واپس آگئے اور یہیں اُنہوں نے وفات پائی۔

خواجہ رحمت اللہ تورہ کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ سعید اللہ خاں اور عبدالرحمٰن خاں بیگ ان دونوں بھائیوں کا انتقال بھی بخارا ہی میں ہُوا۔ عبدالرحمٰن خاں بیگ شاہی منصب دار تھے۔ وہ بلخ میں منتظمِ دیہات اور مہتممِ دارالضرب شاہی تھے، جس کی بدولت اُنھیں خان بیگ کا لقب عطا ہُوا۔ ان کی شادی سمرقند کے ایک معزز گھرانے میں مرزا نصیرالدین خلف ضیار جان بیگ ملک التجار مشہور بہ خواجہ سفر کی بیٹی رابعہ ماہ سے ہوئی جن کے بطن سے تین فرزند قاسم جان، عالم جان اور عارف جان نیز ایک دختر عالمہ جان تولّد ہوئے قاسم جان اور عالمہ جان کی شادی بخارا کے شاہی خاندان میں ہوئی۔ قاسم جان کی بیوی

عزیز النساء خان ہزارہ کی اکلوتی بیٹی تھیں اور عالمہ جان کے شوہر میر عبدالقاسم سید ہزارہ وزیر میر ہزارہ (شاہ بخارا) تھے۔ فوجی سپہ سالار میر نظر ہزارہ کا کسی بنا پر گورنر معین الملک کے دور میں قتل ہوا۔ بخارا میں سیاسی بحران اور سماجی افراتفری کی وجہ سے قاسم جان عالم جان اور عارف جان نے احمد شاہ کے عہد (۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء) میں وسط ایشیا ماوراءالنہر سے ترکانِ ازبک کی ایک جماعت لے کر ۱۷۵۰ء میں ہندوستان کا رُخ کیا۔ ان دنوں دہلی میں شاہ عالم کی حکومت تھی اور پنجاب میں معین الملک عرف میر منّو خلف نواب قمرالدین خان وزیر محمد شاہ حاکم تھے، نیز حکومتِ دہلی کی جانب سے مرزا محمد بیگ گورنر اٹک مقرر کئے گئے تھے جن کی بیٹی سے عارف جان کی شادی ہوئی۔

عبدالرحمٰن خان بیگ کے تینوں فرزند میر منّو کی رفاقت میں چلے گئے تھے، اور ان بھائیوں نے اپنی جواں مردی اور بہادری سے پنجاب میں اپنا نام پیدا کیا۔ تھوڑے عرصہ بعد میر منّو کا انتقال ہوگیا تو اُنھوں نے دہلی کا قصد کیا، لیکن اس دوران شاہ عالم بنگال میں میرن کے مقابلہ میں اپنی فوج لئے خیمہ زن تھے۔ یہ برادران بھی وہیں پہنچے اور شجاعت، بہادری اور وفاداری کا ثبوت فراہم کیا۔ شاہ عالم نے قاسم جان کی بہادری سے خوش ہوکر نواب شرف الدولہ سہراب جنگ کا خطاب دیا اور ہفت ہزاری کے منصب سے نوازا۔ بعد ازیں تینوں بھائی شاہ عالم کے ہمراہ دہلی وارد ہوئے اور یہیں پر سکونت اختیار کی۔ دہلی بلیماران میں گلی قاسم جان آج بھی اُنھیں قاسم جان کے نام سے منسوب ہے، جہاں پر اُنھوں نے ایک مسجد بھی تعمیر کروائی جو آج بھی موجود ہے اور اس علاقے میں آج بھی اس خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔

لوہارو خاندان کے لوگوں کا تعلق تورانی نسل سے ہے جو عموماً اپنوں ہی میں رشتہ داریاں کرتے تھے اور نام کے ساتھ مرزا یعنی امیرزادہ لگانا باعث فخر سمجھتے تھے۔ عارف جان کے پڑپوتے نواب علاؤالدین خان نے اپنی ایک قلمی بیاض میں اپنی دو قوموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک ملکی اور دوسری قومی۔ وہ اپنی قومی نسبت تاتارے جوڑتے ہیں جو کہ برلاسی ہے اور وہ خود کو چغتائی برلاس قوم سے تحریر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے چچا نواب ضیاءالدین احمد خاں

نیرّ رخشاں اور ان کے فرزند اصغر مرزا سعید الدین احمد خان طالب اپنا شجرۂ نسب حضرت علی سے جا ملاتے ہیں اور عارف جان کو خواجہ احمد لیسوی کی نسل سے ظاہر کرتے ہیں۔ درحقیقت جن اہلِ سادات کی مغل یا پٹھان سے رشتہ داریاں ہوئیں، وہ علوی کہلائے اور بعض کا سلسلہ مغل برلاس سے جا ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوہارو خاندان میں علوی بھی ہیں اور مغل بھی۔ خواجہ عبدالرحمٰن کے جدِ اعلیٰ خواجہ احمد لیسوی علوی تھے لیکن شاہی منصب عطا ہونے کے باعث تذکرہ نگار اُنھیں خان اور بیگ لکھتے ہیں۔ تاہم سرہنری ایلیٹ اپنی کتاب تاریخ انساب میں عارف جان کے فرزند نواب احمد بخش خان کو مغل لکھا ہے، جبکہ وہ شروع میں اپنے نام کے ساتھ مرزا کا لقب لگاتے تھے۔ ۱۸۲۳ء میں نواب احمد بخش خان کے صاحبزادے نواب شمس الدین احمد خان اور ابراہیم علی خان سے خط و کتابت کرتے وقت جنرل ڈیوڈ اختر لونی نے ان کے ناموں کے ساتھ ہمیشہ مرزا کا لقب استعمال کیا ہے، اور ۱۸۳۳ء میں نواب شمس الدین احمد خان کی بنی ہوئی مہر پر "ترک" کندہ تھا۔

نواب قاسم جان کو جنگوں سے فرصت نہ ملی۔ عالم جان اور عارف جان دیہات اور جاگیر کے انتظامات میں مشغول رہے۔ قاسم جان اور عارف جان دونوں بھائیوں کا انتقال ایک دوسرے کے بہت کم وقفہ کے بعد ہُوا۔ شرف الدولہ سہراب جنگ نواب قاسم جان کے چار بیٹے محمد بخش خان، فیض اللہ بیگ خان، قدرت اللہ بیگ خان اور نبی بخش خان پیدا ہوئے۔ کیونکہ بڑے بیٹے محمد بخش خان کاروبار ریاست سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے لہٰذا اُن سے چھوٹے فیض اللہ خان کچھ عرصہ بعد رئیس مقرر ہوئے اور اُنہیں ان کے والد کا خطاب سہراب جنگ عطا کیا گیا۔ محمد بخش خان کے صرف ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام فتح اللہ بیگ خان تھا۔ نواب فیض اللہ خان کے دو بیٹے نواب غلام حسین خان مسرور اور نقشبند خان نیز ایک بیٹی نجم النساء بیگم پیدا ہوئیں۔ قدرت اللہ بیگ کی دو شادیاں ہوئیں، پہلی بیوی سے صرف چار بیٹیاں ہی پیدا ہوئیں اور دوسری بیوی سے ایک بیٹی حاجی بیگم اور دو بیٹے معین الدین حسن خان اور محمد حسن خان تولّد ہوئے۔ حاجی بیگم کی شادی نواب ضیاء الدین خان خلف نواب احمد بخش خان سے ہوئی تھی۔

نواب فیض اللہ بیگ خان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند نواب غلام حسین خان مسرورؔ کے ہاتھ عنانِ ریاست آئی لیکن اُنھیں اپنی بدروی کی بدولت ریاست سے ہاتھ دھونا پڑے۔ البتہ اُنھیں اور ان کے چھوٹے بھائی نقش بند خان کو پوری زندگی ایک ایک ہزار روپے ماہانہ دربار سے ملتے رہے۔

نواب غلام حسین خان کی دو شادیاں ہوئیں۔ ان کی پہلی بیوی بنیادی بیگم بنت الٰہی بخش خاں معروف سے دو صاحبزادے نواب زین العابدین خان عارفؔ اور نواب حیدر حسین خان پیدا ہوئے۔ ابھی یہ خورد سال ہی کے تھے کہ ماں باپ میں نفاق پیدا ہوگیا اور وہ باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔ مطلقہ بنیادی بیگم جو غالبؔ کی خواہر نسبتی تھیں، نے اپنے ان بچوں کی پرورش دستور زمانہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اعلیٰ پیمانے پر کی اور اُنھیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلوائی۔

بنیادی بیگم کی بہن امراؤ بیگم جو غالبؔ کے عقد میں تھیں، کے سات بچے پیدا ہوکر مر گئے تو بڑی بہن نے اپنا بڑا بیٹا نواب زین العابدین خان عارفؔ، چھوٹی بہن کو سونپ دیا اور یہ غالبؔ کی زندگی میں نورالعین کی حیثیت اختیار کر گیا۔

نواب زین العابدین خان عارفؔ کو انگریزی سرکار سے اڑھائی ہزار روپے ماہانہ ملتے تھے۔ جب اکیس برس کی عمر میں ان کی شادی فیروز پور جھرکا کے رئیس نواب احمد بخش خاں کی صاحبزادی نواب بیگم سے ہوئی تو شادی کے فوراً بعد فیروز پور جھرکا سے بھی اڑھائی سو روپے ماہوار جاری ہوگئے۔ گو نواب بیگم کا شادی کے دو سال بعد انتقال ہوگیا تھا۔ تاہم مذکورہ رقم انھیں تا حیات ملتی رہی۔ عارفؔ کی دوسری شادی دہلی کے ایک معزز خاندان میں مرزا محمد علی بخارائی کی بیٹی بستی بیگم سے ہوئی جس کو نواب دلہن کا خطاب دیا گیا۔

زین العابدین خان عارفؔ ایک ذی شعور شاعر تھے۔ اُنھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر سے کلام پر اصلاح لی اور ان کے رنگ میں ایک دیوان مرتب کیا۔ لیکن غالبؔ کی شاگردی میں آنے کے بعد وہ دیوان اُنھوں نے تلف کر دیا اور اُنھوں نے اپنا دوسرا دیوان "مطلع مہر سعادت" غالبؔ کے تتبع میں لکھا۔ وہ اپنی جودتِ طبع اور ذہن رسا کی

بدولت غالب کو بہت عزیز تھے۔ غالب کے مندرجہ ذیل قطعہ سے ان کے دل میں عارف کے لئے محبت کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ رخش شمع دودمانِ منست

نواب دلہن کا بھری جوانی میں دردِ گردہ کی بنا پر انتقال ہوگیا اور چند ماہ بعد بیوی کے غم میں پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۸۵۲ء میں محض پینتیس سال کی عمر میں بعارضۂ تپ و اسہال عارف بھی اس دنیا سے رحلت فرما گئے، اور غالب نے ان کی وفات پر نہایت قلق اور پُر درد انداز میں یہ شعر کہا۔

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

عارف کی قبر ان کے نانا نواب الٰہی بخش خان معروف کے قبرستان میں حضرت محبوبِ الٰہی میں غالب کے پائنتی ہے۔

زین العابدین خان عارف کے بھائی غلام حیدر حسین خان کی شادی بھی نواب احمد بخش خان فخر الدولہ والیٔ لوہارو کی صاحبزادی ہی سے ہوئی۔ اس کا نام مہ رخ سلطان بیگم تھا، جو نواب بیگم کی باپ سے سگی لیکن ماں سے سوتیلی بہن تھی۔

نواب قاسم جان کو شرف الدولہ سہراب جنگ کے خطاب کے ساتھ جتنی ریاست مغلیہ سلطنت سے عطا ہوئی تھی وہ ان کے صاحبزادے فیض اللہ خان بیگ کی بد روی کی بدولت انگریزی حکومت نے ضبط کر لی تھی۔ ان کے فرزند نواب غلام حسین خان مسرور بھی بہت فضول خرچ انسان تھے۔ انہوں نے اپنے خاندانی بیوی بچوں کی طرف کبھی بھی توجہ نہیں دی تھی۔ انھیں ایک ہزار روپیہ ماہانہ انگریزی سرکار سے تا حیات ملتا رہا۔ انھوں نے سنگھی جان نام کی ایک دوسری عورت سے شادی کی، جس سے ان کے چار بچے پیدا ہوئے۔ غلام حسن خان محو ان میں سب سے بڑے تھے۔ سنگھی جان کے بطن سے جو لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام ننھی بیگم تھا۔ نواب غلام حسین خان مسرور کا ۱۸۵۴ء میں انتقال ہوا۔

مرزا غلام حسن خاں محوؔ گو عارف کے ماں کی جانب سے سوتیلے بھائی تھے۔ تاہم ان کو اپنے سوتیلے بھائیوں سے اپنے حقیقی بھائی کی طرح محبت تھی۔ محوؔ نے شروع شروع میں ذوقؔ کو اپنا کلام دکھایا لیکن بعد میں عارفؔ انھیں غالبؔ کی شاگردی میں لے گئے اور کبھی کبھی خود بھی ان کے کلام کی اصلاح کر دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ محوؔ کی عارفؔ اور نواب ضیاءالدین احمد خاں نیرؔ رخشاں سے کچھ کہی سنی ہو گئی جس کا ذکر ایک نظم میں وہ غالبؔ کو مخاطب کر کے اس طرح کرتے ہیں۔

ع نیرؔ و عارفؔ ہوئے ہیں میرے دشمن

محوؔ شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے اور نواب علاءالدین احمد خاں کی بنائی ہوئی "جلسہ شطرنج۔ سوسائٹی کے رکن بھی تھے۔

نواب زین العابدین خاں عارفؔ کی بیوی نواب دلہن عالم شباب ہی میں دو معصوم بچے مرزا باقر علی خاں اور مرزا حسین علی خاں جنھوں نے بعد میں اپنا تخلص شاداںؔ رکھا چھوڑ کر فوت ہوئیں۔ ان کے تھوڑے عرصہ بعد ہی عارفؔ بھی اس دار فانی کو خیرباد کہہ کر راہیٔ عالمِ بقا ہو گئے۔ اس وقت مرزا حسین علی خاں کی عمر صرف دو سال ہی کی تھی۔ اس لئے وہ غالبؔ کو بہت عزیز اور دل و جان سے پیارے تھے۔ امراؤ بیگم نے چھوٹے لڑکے کو اپنی آغوشِ شفقت میں لیا اور بڑے لڑکے مرزا باقر حسین خاں جو اپنی دادی بنیادی بیگم سے بہت مانوس تھے، ان کے پاس چلے گئے۔ ننھا بچہ مرزا حسین علی خاں غالبؔ کے دل میں ایسا اترا کہ اگر کبھی شاداںؔ کی شوخیوں سے بیزار ہو کر اسے نواب ضیاءالدین خاں کے ہمراہ لوہارو بھیج دیا تو اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اگلے ہی روز داروغہ کلوؔ کو اسے لینے بھیجدیا۔ درحقیقت یہی وہ لاڈلا تھا جو عارفؔ کی موت کے بعد غالبؔ کے دل کے زخموں کا مداوا بنا۔

بہو بیٹے کے غم میں بنیادی بیگم بھی زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں۔ لہذا بڑے لڑکے کی کفالت بھی مرزا غالبؔ ہی کو کرنا پڑی۔ ان دونوں بھائیوں سے ان کو اس قدر محبت ہو گئی کہ اُن کی ہر طرح کی ناز برداریاں کرتے تھے اور اُنھیں کبھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے

دیتے۔ یہاں تک کہ رام پور کے دونوں اسفار کے دوران دونوں بھائی مرزا غالب کے ساتھ ہی رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات رقم کرتے ہوئے "دستنبو" میں مرزا غالب فرماتے ہیں :-

"اس سے پہلے صرف بیوی تھی، نہ کوئی لڑکا تھا نہ لڑکی۔ تقریباً پانچ سال ہوئے کہ میں اپنی بیوی (جو میری تباہی کی ذمے دار ہے)، کے خاندان کے دو بے ماں باپ کے بچوں (باقر علی خان اور حسین علی خان) کو لے کر پال لیا ہے ان شیریں زباں بچوں سے مجھ کو بے انتہا محبت ہے۔ اس عالمِ بے چارگی میں (دونوں بچے)، میرے ساتھ ہیں اور میرے ساتھ ہیں اور میرے دامن وگریبان کے پھول ہیں۔

وہ دونوں ناز پروردہ بچے پھل، دودھ، مٹھائی مانگتے ہیں۔ لیکن ان کی خواہش پوری کرنا میرے بس میں نہیں۔ افسوس: افسوس! اس ایک بات کو کیا کہوں جب تک زندہ ہوں روٹی اور پانی کی فکر رہے گی اور مرنے کے بعد کفن دفن کی"[1]

باقر علی خاں جن کا تخلص کاملؔ تھا، کی شادی سترہ سال کی عمر میں نواب ضیاءالدین احمد خان نیر رخشاں کی صاحبزادی معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم سے شاہی جاہ وحشمت سے ہوئی۔ اس وقت زمانی بیگم کی عمر صرف بارہ سال کی تھی۔ یہ رشتہ نواب نیر رخشاں اور عارفؔ کے باہمی ارتباط ورفاقت کا نتیجہ تھا۔ علاوہ ازیں نیرؔ نے غالبؔ کو دیے ہوئے قول کی تکمیل کی اور غالبؔ نے بھی نواب ضیاءالدین احمد خان کے برابر قدر کرکے اپنے اس پوتے کی شادی کی۔

شادی کے بعد باقر علی خان سسرال چلے گئے۔ ان کے اخراجات ان کے خسر برداشت کرنے لگے۔ لیکن باقر علی خان کی حمیت نے یہ بات زیادہ دیر تک گوارا نہ کی۔ بالآخر شادی کے تین سال بعد انہوں نے ریاست الور کے مہاراجہ شیودان سنگھ کے دربار میں ملازمت اختیار کرلی۔ اس وقت باقر علی خان کی عمر بیس برس تھی۔ وہ فنونِ سپاہ گری میں اپنے اجداد سے کم نہ تھے۔ مہاراجہ بھی ان کے بہت قدر داں تھے۔ انہوں نے پہلے

تو انھیں اپنے خاص مصاحبوں میں رکھا، پھر فوج میں بھرتی کر کے جلد ہی کپتان کے عہدہ پر فائز کر دیا۔ وہ اس قدر دلیر اور بہادر تھے کہ شیر کا شکار برچھے سے کھیلا کرتے تھے۔

نواب ضیاءالدین خان اپنے جوان بیٹے کی موت سے دلبرداشتہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں اُنہوں نے اپنے داماد باقر علی خان کو الور سے بُلا لیا تاکہ وہ ریاست کا کاروبار سنبھالیں۔ لائق داماد نے بھی ذمہ داریاں قبول کیں، لیکن زندگی نے اُن کے ساتھ بھی وفا نہ کی اور اپنے خسر کے دیکھتے دیکھتے صرف ۲۸ برس کی عمر میں سات ماہ تپ دق جیسے موذی مرض میں مبتلا رہ کر اس دنیا سے منہ موڑ گئے اور اُنھیں اپنے خاندانی قبرستان میں حضرت محبوب الٰہی کے پائنتی دفن کیا گیا۔

باقر علی خاں کے صرف تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم تھیں۔ وہ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئیں اور ان کا انتقال ۱۰ مارچ ۱۹۵۲ء میں ہُوا۔ مرزا غالب لاڈ میں انھیں مرزا جیون بیگ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ غالب کے انتقال کے وقت ان کی عمر چار برس کی تھی۔ وہ مرزا غالب کو اس قدر عزیز تھیں کہ مرتے دم بھی ان کی جان سلطان بیگم میں اٹکی رہی اور ان کے منہ سے دادا جان کے الفاظ سنتے ہی عالم سکرات کے باوجود مرزا نے آنکھیں کھول کر انھیں دیکھا اور جان کو جان آفریں کے حوالے کر دیا۔ محمد سلطان بیگم بارہ برس کی ہوئیں تو ان کی شادی ان کے بڑے ماموں شہاب الدین خان ثاقب کے بڑے فرزند مرزا شجاع الدین احمد خان تاباں سے کر دی گئی۔ لیکن ان کے کوئی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

منجھلی بیٹی فاطمہ سلطان بیگم عرف بندو بیگم نواب علاؤالدین احمد خان علائی کے چوتھے فرزند نواب زادہ بشیر احمد خان کے عقد میں تھیں۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تولد ہوئیں۔ ان کے بڑے لڑکے کا نام معزالدین سامر مرزا اور چھوٹے کا نام ناصرالدین خسرو مرزا تھا، نیز بڑی صاحبزادی عالیہ سلطان بیگم اور چھوٹی فخر سلطان بیگم تھیں۔ عالیہ سلطان بیگم کی شادی عبدالصمد خان سے ہوئی۔ ان کی چھوٹی صاحبزادی فخر سلطان بیگم

نواب سرامیرالدین احمد خان کے صاحبزادہ نواب امیرالدین اعظم مرزا ولی عہد لوہارو سے بیاہی گئیں۔ ان کے چھ بچے پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال بہت ہی کم عمر یعنی صرف ۲۴ سال کی عمر میں ہوا۔ ان ہی کے بڑے صاحبزادے نواب امین الدین احمد خان شہریار بعد میں والیٔ لوہارو بنے۔ نواب امین الدین احمد خان ثانی شہریار مرزا نواب علائی کے پڑپوتے تھے۔

باقر علی خان کی چھوٹی بیٹی رضیہ سلطان بیگم عرف چھن بیگم اپنے والد کے انتقال کے وقت چھ ماہ کی تھیں۔ ان کی شادی لیفٹیننٹ کرنل ذوالنور علی احمد سے ہوئی اور ان کے پانچ لڑکے و پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

باقر علی خان کی بیوی نواب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم جونیر کی بیٹی اور عارف کی بڑی بہو تھیں۔ جنہیں مرزا غالب خود اپنے ہاتھوں سے بیاہ کر گھر لائے تھے، کا انتقال ۹۳ سال کی عمر میں ۱۰ مئی ۱۹۴۵ء کو ان کی محل سرا "ضیا منزل" میں ہوا اور انھیں خاندانی مقبرے صندل خانہ مرزا بابر والی کوٹھی یعنی قطب صاحب دفن کیا گیا۔

باقر علی خاں کے چھوٹے بھائی مرزا حسین علی خان شاداں کی کیونکہ غالب کی گود میں پرورش ہوئی، شعروشاعری کا ماحول انھیں بچپن ہی سے ملا۔ اس لئے انہوں نے کم سنی ہی میں شعر موزوں کرنے شروع کر دئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب دہلی میں ایک معرکۃ الآرا مشاعرہ ہوا جس میں نامور شعراء نے شرکت کی اور دہلی کی تباہی و بربادی کا ذکر پُر درد اور غمگین پیرائے میں ادا کیا، اس مشاعرے میں شاداں نے محض ۹ سال کی عمر میں شعر سنائے جو نوحہ کردگان کے لئے ایک امید کی کرن بن کر پھوٹے۔ اس مشاعرہ میں سنائے گئے کلام کو ایک مجموعہ کی شکل میں "فغان دہلی" کے عنوان سے اکمل المطابع مطبع خانہ نے ۱۸۶۳ء میں شائع کیا جس میں اس موقعہ پر سنایا ہوا شاداں کا بھی ایک شعر شامل ہے۔

مٹ گیا خوب ہوا، نام ونشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے، مرثیہ خوانِ دہلی

شاداںؔ نے شروع میں غالب سے اصلاح لی۔ بعد میں حالیؔ اور سالکؔ کو بھی اپنا

کلام دکھایا۔ ان کی شادی خاندان ہی کی ایک دخترِ نیک بخت نواب عارف جان کے پوتے حسن علی جان کی پوتی اور اکبر علی خان کی بیٹی حسن جہاں بیگم سے ہوئی۔ لیکن اولاد سے محروم رہے۔ غالب کی موت کے بعد رامپور دربار سے وابستہ ہوگئے جہاں سے انھیں ساٹھ روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ وہ اپنے بڑے بھائی باقر علی خان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اس لئے ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ بھائی کی جوان موت نے ان کو گہرا صدمہ پہنچایا اور وہ ذہنی توازن کھو بیٹھے، نیز ۲۹ برس کی عمر میں ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء کو اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ شاداں کو ان کے بڑے بھائی کے پہلو اور حضرت محبوب الٰہی کے پائنتی خاندانی قبرستان میں دفنایا گیا۔ قاسم جان کے چھوٹے بھائی عارف جان کے چار لڑکے نبی بخش خان، نواب احمد بخش خان، الٰہی بخش خان معروف اور محمد علی خان تھے۔ احمد بخش خان اپنے خاندان میں پہلے نواب تھے۔ انہوں نے ابتدائی دور میں کچھ عرصہ گوالیار میں مرہٹوں کی ملازمت کی۔ پھر جب کسی بنا پر یہ ملازمت چلی گئی تو انہوں نے گھوڑوں کا بیوپار شروع کیا۔ اجمیر شریف ایک گھوڑا فروخت کرکے دہلی آرہے تھے کہ ان کی ملاقات الور کے مہاراجہ بختاور سنگھ سے ہوئی تو انہوں نے احمد بخش خان کو ملازمت کی پیش کش کی، جسے انہوں نے ضرورت کے پیش نظر بخوشی قبول کرلیا اور دوران ملازمت اپنی وفاداری کا ثبوت فراہم کیا جس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے الور کے مہاراجہ نے انگریزوں سے ایک معاہدہ کے بعد ان کو دہلی انگریزی سرکار میں اپنے وکیل کے طور پر مقرر کردیا جس کی حیثیت ایک سفیر کی سی تھی۔ اسی دوران انگریزوں کی ریاست بھرت پور سے جنگ چھڑ گئی۔ انہوں نے ڈیگ کے قلعہ پر حملہ کردیا۔ احمد بخش خان نے مہاراجہ بختاور سنگھ کو انگریزوں کی مدد کے لئے تیار کیا اور مہاراجہ کی جانب سے بذاتِ خود الور کی فوج کا ایک دستہ لے کر جنگ میں شریک ہوئے۔ لڑائی کے دوران انہوں نے انگریز سپہ سالار فریزر کی جان بچائی گو زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے کچھ روز بعد ان کی موت ہوگئی۔ تاہم مرنے سے قبل فریزر نے احمد بخش خان کے لئے ایک خوشنودی کی سند لکھی اور انگریز سرکار سے درخواست کی کہ وفاداری کا مناسب صلہ دیا جائے۔

لہذا جب دہلی میں فتح کا جشن ہوا تو انگریزی فوج کے کمانڈر ان چیف لارڈ لیک نے سپہ سالار فریزر کی سفارشات کو مدِنظر رکھتے ہوئے گوڑگاؤں ضلع میں پانچ محلوں یعنی فیروزپور جھرکا، بوناہانہ، سانگرس، بھور اور نگینہ کی جاگیر عطا کی اور انھیں فخرالدولہ دلاورالملک، رستم جنگ کے خطاب سے نوازا۔ ان علاقہ جات کی تقریباً تین لاکھ روپے سالانہ آمدن تھی۔ اسی جشن کے موقعہ پر مہاراجہ بختاور سنگھ کو بھی ۱۴ محلا اعزازات سے نوازا گیا۔ اسی وقت انہوں نے بھی خوش ہوکر احمد بخش خان کو لوہارو پرگنہ بخش دیا اور اب احمد بخش خان فیروزپور جھرکا اور لوہارو کے باقاعدہ نواب بن گئے۔

۲۴۲ دیہات پر مشتمل ریاست فیروزپور جھرکا ضلع گوڑگاؤں کی ایک تحصیل ہے جس کا رقبہ ۱۶ ار ۸۱۴ مربع کلومیٹر ہے جس کا شہری علاقہ کل ۴ء ر ۳ مربع کلومیٹر ہے جو کل رقبہ کے لحاظ سے پورے ضلع میں چوتھے درجہ پر اور محض شہری رقبہ کے اعتبار سے پانچویں درجہ یعنی سب سے آخر میں شمار ہوتا ہے۔ ہریانہ ساہتیہ اکادمی کی شائع شدہ کتاب " ہریانہ اتہاسک سنہاولوکن " میں فیروزپور جھرکا کے بارے میں لکھا ہے۔

"لگ بھگ ...... ۵ ای۔ پو۔ سے دکشنی (مدراس پردیش)، تتھا اتری (سوہن ندی کشمیر میں)، بھارت میں مانو کا نواس رہا ہے۔ لگ بھگ اسی کال میں پنجور (چنڈی گڑھ کے سمیت)، تتھا فیروزپور جھرکا (گوڑگاؤں ضلع) کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں ہریانہ پردیش میں بھی مانو کی گتی ودھیاں رہی تھیں۔ اسی کال کا مانو پتھر کے اوزاروں کا پریوگ کرتا تھا۔ وہ شکار تتھا آہار سنکلن کے سہارے اپنا نبھا کرتا تھا۔ یہ یگ جسے ہم پورا پاشان کال کہتے ہیں لگ بھگ ...... ۸ ای۔ پو۔ تک چلا۔" ے

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ریاست فیروزپور جھرکا کوئی نئی تہذیب نہیں بلکہ یہ ہندوستان کی قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ جہاں تک لوہارو کا تعلق ہے جو کہ ہریانہ کے مشرق میں راجستھان سرحد کے ساتھ منسلک ہے۔ اس کی بھی عہدِ حقیقی کی تاریخ بارے کچھ کہنا مشکل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ 'لوہار' سے مستعار ہے۔ یہ خطہ

کبھی جے پور ریاست کا حصہ تھا۔ ۱۸ ویں صدی میں اس کی ایک آزاد ریاست کے طور پر بنیاد رکھی گئی۔ بعد ازیں یہ برطانوی تسلط میں آگئی اور انہوں نے اسے مہاراجہ الور کو منتقل کر دیا۔ مہاراجہ الور نے برطانوی سرکار کی منظوری سے اسے نواب احمد بخش خان کو سونپ دیا۔

فخرالدولہ دلاورالملک نواب احمد بخش خان بہادر رستم جنگ نے غالباً تین شادیاں کیں۔ ان کی پہلی بیوی جو ان کی چچازاد تھیں، سے ان کے چار بچے پیدا ہوئے، لیکن کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ پھر ان کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ الور میں ملازمت کے دوران احمد بخش خان کے مدی نام کی عورت سے تعلقات پیدا ہو گئے، جسے بعد میں انہوں نے بہو بیگم کا خطاب دیا۔ اس کے بطن سے دو لڑکے شمس الدین خان اور ابراہیم علی خان نیز دو لڑکیاں نواب بیگم اور جہانگیرہ بیگم پیدا ہوئیں۔ ابراہیم علی خان کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔ نواب بیگم کی شادی زین العابدین خان عارف سے ہوئی اور جہانگیرہ بیگم کی شادی ایران میں محمد اعظم خان سے ہوئی۔ نواب احمد بخش خان کی ایک اور باقاعدہ شادی بیگم جان جس کا انتقال ۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو ہوا سے ہوئی۔ یہ نیاز محمد بیگ برلاس مغل کی بیٹی تھی اس کے دو لڑکے امین الدین احمد خان اور ضیاء الدین احمد خان نیز چار لڑکیاں منورجہاں بیگم، ماہ رخ بیگم، بادشاہ بیگم اور حاجی بیگم پیدا ہوئیں۔ نواب شمس الدین خان کی والدہ بہو بیگم کیونکہ باقاعدہ منکوحہ نہیں تھیں اس لئے اہل خاندان شمس الدین خاں کو نواب بنانے کے حق میں نہ تھے، اس ڈر سے احمد بخش خان نے انھیں اپنی زندگی ہی میں اکتوبر ۱۸۲۶ء میں فیروز پور جھرکا کا حکمراں اعلان کر دیا اور لوہارو کی جاگیر خاندانی بیگم کے بچوں کے حصہ میں گئی۔ نگینہ کا علاقہ ابراہیم علی خان کے حصہ میں آیا تھا۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب احمد بخش کا جب انتقال ہوا تو برطانوی سرکار نے ۷ دسمبر ۱۸۲۷ء میں باقاعدہ جانشینی کی خلعت عطا کی۔

اپنے والد نواب احمد بخش خان کے انتقال کے بعد نواب شمس الدین خان نے پرگنہ لوہارو پر بھی اپنا حق جتایا جو کچھ عرصہ کوشش کے بعد ان کو مل گیا۔ لیکن ایک انگریز ریزیڈنٹ فریزر جو نواب احمد بخش خان کے پرانے دوست تھے، کی دخل اندازی سے

سے یہ علاقہ دوبارہ نواب امین الدین خان کو مل گیا، جس سے نواب شمس الدین کے دل میں ولیم فریزر کے خلاف دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس عناد کی وجہ ایک عورت بھی بنی تاہم نواب شمس الدین خان نے اپنے ایک وفادار کریم بخش خان کو دہلی بھیج کر انگریز ریذیڈنٹ اور کمشنر دہلی، ولیم فریزر پر گولی چلوائی اور ان کا موقع پر ہی انتقال ہوگیا۔ اس قتل کے جرم میں کریم بخش خان کو ۲۶ر اگست ۱۸۳۵ء کو اور نواب شمس الدین احمد خان کو ۸ر اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی کی سزا ہوئی۔

نواب شمس الدین احمد خان کا پہلا نکاح ۱۱ر جولائی ۱۸۲۸ء کو مرزا مغل بیگ کی صاحبزادی افضل النساء بیگم عرف بھانی بیگم سے ہوا۔ اس کے بطن سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ایک احمد النساء بیگم اور دوسری شمس النساء بیگم۔ احمد النساء بیگم کی شادی والیٔ جھجر نواب عبدالرحمٰن خان کے چچازاد بھائی نواب سعادت علی خان سے ہوئی اور ان کی ہی بڑی صاحبزادی سکندر جہاں بیگم کا نکاح ثاقب سے ہوا۔ شادی کے موقعہ پر غالب نے ایک سہرا بھی لکھا۔

نواب شمس الدین احمد خان کا دوسرا نکاح ۲۴ر اپریل ۱۸۲۹ء کو حسینی بیگم بنت ولی محمد سے ہوا۔ اس بیگم کو بہو بیگم کا خطاب ملا۔ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

مذکورہ دو شادیوں کے علاوہ نواب شمس الدین احمد خان کی دو داشتائیں بھی تھیں۔ ایک کا نام چھپا تھا جس نے ایک لڑکی رحمت النساء کو جنم دیا۔ دوسری عورت وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم دختر محمد یوسف سادہ کار تھیں، ان کے بطن سے نواب مرزا داغ دہلوی پیدا ہوئے جن کا بچپن میں نام ابراہیم رکھا گیا تھا۔

مولانا غلام رسول مہر اپنی کتاب "غالب" میں تحریر کرتے ہیں کہ نواب شمس الدین احمد خان کے نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف دو لڑکیاں تھیں[۴] لیکن مالک رام نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ داغ دہلوی کی والدہ چھوٹی بیگم نواب شمس الدین کی منکوحہ بیوی نہ تھیں[۴]۔ "نقوش داغ" میں ساحر ہوشیارپوری لکھتے ہیں۔

"مرزا داغ نے بھی عمر بھر میں اپنے آپ کو چھوٹی بیگم کا بیٹا کہلوانا ہی پسند کیا اور کہیں اپنے باپ کا ذکر نہیں کیا۔"[۵]

تلامذۂ غالب ، میں داغ کی جائے پیدائش محلہ بلی ماران دہلی لکھی ہوئی ہے[۶] جبکہ ان کی ولادت ۲۵ رمئی ۱۸۳۱ء کو بدھ کے روز دن کے قریب دو بجے فیروز پور جھرکا میں ہوئی[۷] اور یہ انکشاف سب سے پہلے امیر مینائی نے کیا کہ مرزا داغ نواب شمس الدین احمد خان کی اولاد تھے[۸] اس بات کی تائید مالک رام نے "تلامذۂ غالب" میں بھی کی ہے[۹]

نواب شمس الدین احمد خان کی موت کے بعد داغ کی تقریباً چار سال تک پرورش، ان کی خالہ عمدہ بیگم نے کی۔ جب یوسف علی خان والیٔ رام پور بنے تو عمدہ بیگم دہلی سے داغ کو بھی اپنے ساتھ رام پور لے گئیں۔ اس دوران چھوٹی بیگم کے نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں اور پھر ایک انگریز مارسٹن بلاک سے کچھ عرصہ تعلقات رہے۔ پھر وہ تراب علی کے گھر چلی گئیں اور بعد میں صاحب عالم ولی عہد شاہ دہلی سے نکاح کیا نیز ان کی تیسری بیوی کی حیثیت سے لال قلعہ میں گئیں اور نواب شوکت محل کا خطاب پایا۔ یہاں پر داغ کی تعلیم وتربیت کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوا اور انھیں خاقانیٔ ہند ذوق کی شاگردی نصیب ہوئی۔

نواب احمد بخش خان کے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف زاہد اور عبادت گزار انسان تھے۔ وہ ساتھ ہی ایک اچھے شاعر بھی تھے اور انہوں نے اس میدان میں ناموری بھی حاصل کی۔ غالباً وہ خاندان لوہارو کے پہلے شاعر تھے۔ وہ ذہن رسا اور جودتِ طبع کے مالک تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی دولت مند امیرزادے کی بجائے غالب جیسے ہونہار، دور اندیش اور مفکر شاعر اور ایک یتیم لڑکے سے اپنی بیٹی کی شادی کی تھی۔

آب حیات میں محمد حسین آزاد نے معروف کے استاد کا نام ذوق تحریر کیا ہے[۱۰] لیکن نواب احمد سعید خان طالب نے دیوانِ معروف کے دیباچہ میں اس بات کی تردید کی ہے[۱۱]۔ جبکہ حمیدہ سلطان "گلشن بے خار" کے حوالے سے معروف کے استاذ کا نام شاہ نصیر لکھتی ہیں[۱۲]

معروف کا انتقال ۱۲۴۲ھ میں اسّی سال سے زیادہ عمر میں ہوا۔ انھیں اُن کے ذاتی قبرستان محبوب الٰہی میں چونسٹھ کھمبہ کے قریب دفن کیا گیا۔ اسی قبرستان میں ان کے صاحبزادے علی بخش خان رنجور اور دوسرے عزیز و اقارب کی بھی قبریں ہیں۔ مرزا غالب کی قبر بھی اپنے خسر کے پائنتی ہے اور ساتھ ہی ان کی بیوی امراؤ بیگم کی اور

فرزند عارف کی قبریں ہیں۔ غالب سوسائٹی نے اب غالب، امراؤ بیگم اور عارف کی قبروں کو ایک دیوار بناکر اس قبرستان سے الگ کر رکھا ہے۔

نواب الٰہی بخش خان معروف کے صاحبزادے علی بخش خان رنجور ایک عالم انسان تھے۔ موصوف نے غالب کی تصنیف "پنج آہنگ" کا مقدمہ بھی لکھا۔ اُنھیں برطانوی حکومت کی جانب سے ایک مدت تک وظیفہ بھی ملتا رہا۔ غدر کے بعد رنجور دہلی کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لئے حضرت نظام الدین اولیاء کے قریب عرب سرائے چلے گئے اور وہیں پر زندگی کی آخری سانسیں لیں۔

رنجور کی شادی غالب کی حقیقی بھانجی امانی بیگم سے ہوئی۔ ان کے دو لڑکے مرزا غلام فخرالدین خان اور محمد سعید خان تولد ہوئے۔ غالب کی حقیقی بھتیجی یعنی مرزا یوسف کی دختر عزیزالنساء مرزا غلام فخرالدین کے عقد میں تھیں۔ آخری تاجدار تیموریہ بہادر شاہ ظفر کی ذاتی جاگیر علاقہ کوٹ قاسم کے منتظم کے طور پر مرزا غلام فخرالدین خان نے ۱۸۵۷ء تک فرائض انجام دئے اور وہ ہر طرح کے ناگفتہ بہ حالات میں بہادر شاہ ظفر کو روپیہ بھیجتے رہے۔ اس لئے انگریزی سرکار ان سے ناراض ہو گئی اور وہ ان کے عتاب کا نشانہ بنے۔

رنجور کے پوتے اور مرزا محمد سعید خان کے فرزند ارجمند مرزا نصراللہ خان حیدرآباد میں جج کے عہدہ پر فائز رہے۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ قیاس ہے کہ آج بھی ان کی اولاد حیدرآباد ہی میں آباد ہے۔

نواب احمد بخش خان کی خاندانی بیگم کی اولاد میں سے نواب امین الدین احمد خان سب سے بڑے تھے۔ ان کی ولادت ۱۸۱۱ء اور وفات ۳۱ دسمبر ۱۸۶۹ء کو جمعہ کے روز ہوئی۔ ان کو بھی کوٹھی مرزا بابر والی، خاندانی ہرواڑ میں دفن کیا گیا۔ ان کی شادی نواب غضنفرالدولہ محمد وزیر بیگ عرف مینڈھو خان رسالدار سلطنت اودھ کی صاحبزادی ولی النساء بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے نواب علاؤالدین احمد خان علائی پہلے والی لوہارو، ۲۵ اپریل ۱۸۳۳ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ نواب احمد بخش خان نے جب اپنی حکومت کی

تقسیم کی تو ان کے حصہ میں لوہارو پرگنہ آیا۔

نواب امین الدین احمد خان کے فرزند نواب علاءالدین خان علائی کے مرزا غالب کے ساتھ بہت اچھے مراسم تھے۔ ان کی تعلیم غالب ہی کی زیر نگرانی ہوئی۔ غالب نے ان کے نام بہت سے خطوط بھی لکھے جو "عود ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں بھی شامل ہیں، جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ غالب اپنے اس شاگرد کے کہنے پر فکر سخن بھی کرتے تھے اور انھیں مختلف القاب و آداب سے مخاطب کرتے تھے۔

نواب علائی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے بلکہ اردو کے مقابلتاً ان کا کلام فارسی میں زیادہ دستیاب ہے۔ ان کی ادب پروری، سخن فہمی اور شعری شعور کی بنا پر غالب نے انھیں ایک سند سے نواز کر اپنا خلیفہ اور جانشیں مقرر کیا۔ ان کی سخن پروری کا یہ حال تھا کہ ان کا تمام تر وقت علمی اور ادبی مشاغل میں گزرتا۔ انہوں نے لوہارو میں ایک چھاپہ خانہ بھی قائم کیا جس کا نام فخرالمطابع رکھا۔ جہاں سے علمی و ادبی کتابیں شائع ہونے کے علاوہ ایک اخبار "امیرالاخبار" کے عنوان سے شائع ہوتا تھا۔ ان ادبی مشاغل کے علاوہ ایک نواب علائی کو شطرنج کھیلنے کا بھی شوق تھا، جس کی انہوں نے ایک سوسائٹی بنائی جس کی روداد اخبار میں چھپتی تھی۔

نواب علائی کی شادی جلال الدین احمد خان نبیرہ نواب نجیب الدولہ کی دختر ارجمند شمس النسار بیگم سے ۱۸ فروری ۱۸۵۵ء کو نجیب آباد میں ہوئی۔ ان کے پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ لڑکوں کے نام بالترتیب امیرالدین احمد خان، فرخ مرزا عزیزالدین احمد خان، نصیرالدین احمد خان، بشیرالدین احمد خان اور ضمیرالدین احمد خان ہیں۔

نواب امین الدین احمد خان کیونکہ عمر کے آخری دور میں بیمار رہنے لگے تھے۔ اس لئے ان کے صاحبزادے علاؤالدین خان علائی ان کی حیات ہی میں لوہارو کے نواب بن گئے تھے۔ مسند نشینی کی تاریخ "ریاست خداداد" ہے۔ باقاعدہ اختیارات لارڈ نارتھ بروک کے عہد میں ۱۵ اگست ۱۸۷۴ء کو عطا ہوئے اور انھیں خاندانی خطاب نواب فخرالدولہ دلاور الملک رستم جنگ سے نوازا گیا۔ نواب علائی کی وفات ۳۱ اکتوبر

۱۸۸۴ء کو جمعہ کے روز ہوئی۔ ان کو بھی مرزا بابر والی کوٹھی میں ان کے والد کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ امیر مینائی نے نواب علائی کی تاریخ وفات یہ مصرع کہکر نکالی۔

مع مزارِ سایۂ یزدان علاؤالدین احمد خان

والئ لوہارو نواب امیرالدین احمد خان فرخ مرزا کے صاحبزادے کی تین شادیاں ہوئیں۔ اُن کی تیسری بیوی جمیلہ بیگم ہند و پاک کے مشہور و معروف ادیب و شاعر جمیل الدین عالی کی والدہ تھیں جو کہ نواب فرخ مرزا کی ننہال سے قریبی عزیز تھیں۔ ان کے دادا سید ناصر ظہیر نبیرہ خواجہ میر درد تھے۔ عالی کی ولادت یکم جنوری ۱۹۲۶ء کو دہلی میں ہوئی۔ ملک تقسیم ہوا تو انھیں بھی اپنے دوسرے ہم وطنوں کی مانند دہلی کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ پاکستان چلے گئے۔ وہ اپنی علمی و ادبی لیاقت کی وجہ سے ہند اور پاکستان میں یکساں مقبولیت اور اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے جنرل سکریٹری انجمن ترقی اُردو کے اعزازی سکریٹری اور بہت سی ادبی انعام تقسیم کرنے والی انجمنوں کے سکریٹری کے عہدہ پر فائز رہے ہیں۔

عالی کی شادی اپنے ہی خاندان میں صمصام مرزا کی صاحبزادی طیبہ بانو سے ہوئی ہے۔ صمصام مرزا نواب علائی کے منجھلے صاحبزادے مرزا عزیزالدین احمد خان کی اولاد تھے۔

دہلی میں قیام کے دوران جمیل الدین عالی نے اپنے رشتہ کے دادا سراج الدین احمد خاں سائل سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ ۱۹۴۵ء میں استاد کے انتقال کے بعد اُنھوں نے کسی دوسرے اصلاحِ سخن کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

نواب علاؤالدین علائی والئ لوہارو کی تیسری صاحبزادی رضیہ بیگم بہت بہادر، ذہین اور سمجھ دار خاتون تھیں اُن کی شادی فریدآباد کے نواب شفیع نیر سے ۱۸۸۹ء میں ہوئی۔ اور ان کے تین بیٹے سید ہاشمی، سید مطلبی فریدآبادی اور سید ابوتمیم تولد ہوئے۔ سید مطلبی انقلابی ذہن کے مالک تھے۔ اُن کی پیدائش ۱۵ نومبر ۱۸۹۳ء کو ہوئی۔ سید ہاشمی فریدآبادی ۳۰ جنوری ۱۸۹۱ء کو پیدا ہوئے اور اُن کی وفات جنوری ۱۹۶۴ء کو لاہور میں ہوئی۔

نواب اعزالدین احمد خان اعظم مرزا نواب علائی کے پوتے اور نواب سرامیرالدین احمد خان

فرخ مرزا کے صاحبزادے تھے اور اپنے سب سے بڑے بھائی معین الدین احمد خان سے چھوٹے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۸۸۵ء کو پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے والد ہی کی زندگی میں عنان ریاست سنبھالی۔ فرخ مرزا کیونکہ بہت فضول خرچ اور عیش پرست انسان تھے اس لئے ریاست بہت مقروض ہو چکی تھی۔ اعظم مرزا نے اپنے حسن انتظام اور عقل و دانشمندی سے ریاست کے کاروبار کو چلایا نیز ریاست کو قرض کے بار سے آزاد کیا۔

اعظم مرزا کی دو شادیاں ہوئیں۔ اول ان کے عم مرزا بشیر الدین احمد خان کی صاحبزادی ذکیہ سلطان سے جو کہ بہت حسین تھیں۔ اعظم مرزا بھی اُنھیں دل و جان سے چاہتے تھے۔ لیکن ذکیہ سلطان کی عمر نے اُن کے ساتھ وفا نہ کی اور ۲۹ سال ہی کی تھیں کہ داغِ مفارقت دے گئیں۔ اعظم مرزا کی دوسری شادی ذکیہ سلطان ہی کی حقیقی بھتیجی معزالدین سام مرزا کی صاحبزادی خدیجہ سلطان سے ہوئی جس کے پانچ بچے پیدا ہوئے، اور اُن کے بڑے بیٹے نواب امین الدین احمد خان ثانی شہریار مرزا، نواب لوہارو بنے۔

اعظم مرزا کی وفات بیالیس سال کی عمر میں ۳۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ہوئی۔

نواب اعزالدین احمد خان اعظم مرزا کے انتقال کے بعد نواب امین الدین احمد خان ثانی المعروف بہ شہریار مرزا سولہ سال کی عمر میں ولی عہد کی مسند پر بیٹھے۔ اِس موقعہ پر اُن کے والد کے ماموں تاباںؔ نے فارسی میں یوں تہنیت پیش کی۔

تا کے وزد نسیم سرِ لالہ زارِ ما
اکنون دیدہ بہ باشاخ گل نو بہارِ ما
یارب بہ علم و فضل گر آمید امیں دین
یکتائے روزگار شود شہریارِ ما
تاباںؔ زبان کشود ترا شہریار گفت
فخر زمان و فخر زمین افتخارِ ما

نواب امین الدین احمد خان ثانی کی ولادت ۲۳ مارچ ۱۹۱۱ء کو ہوئی۔ اُن کے والد کے انتقال کے بعد ۱۱ جنوری ۱۹۲۷ء کو مسند نشین ہوئی اور ۳۱ جنوری ۱۹۳۱ء

کو اختیارات دے گئے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں دوسری ریاستوں کی مانند ریاستِ لوہارو بھی ختم کردی گئی۔ لہٰذا آپ لوہارو خاندان کے آخری نواب تھے۔ انتقال سے تھوڑا عرصہ قبل آپ موجودہ مشرقی پنجاب کے گورنر بھی رہے۔

موصوف کو ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا۔ آپ نے ایک معاشرتی ناول "فانوس خیال" تحریر کیا۔ آپ کا شاہکار ادبی کارنامہ انبساط و انتشار مثنوی ہے جس میں آپ نے اپنے اجداد کی تاریخ بیان کی ہے۔ نواب شمس الدین احمد خان والئ فیروزپور جھرکا کے پھانسی کے سانحہ کو نہایت دردانگیز پیرائے میں ادا کیا ہے۔

مرزا اعتمادالدین احمد خان شاہجہاں مرزا جو کہ اعزازالدین شاہ رخ مرزا بن نواب سراج الدین احمد خان فرخ مرزا کے بڑے صاحبزادے تھے، اُن کی ولادت ۲۱ مئی ۱۹۱۱ء کو دہلی میں ہوئی اور ان کا انتقال ۱۹۷۷ء میں کراچی میں ہوا۔ ان کی شادی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی پوتی اور نواب اسحاق خان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ملازمت کے اعتبار سے وہ دو سال تک اپنے چچازاد بھائی نواب امین الدین احمد خان والئ لوہارو کے اے ڈی۔سی۔ رہے۔ بعد میں دوسری جنگ عظیم کے دوران فوج میں چلے گئے اور تقسیم وطن کے بعد پاکستان جاکر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ وہاں میجر کے عہدہ تک ترقی پاکر خرابئ صحت کی وجہ سے جلد ہی ملازمت سے پنشن لے لی۔

نواب زادہ صلاح الدین شہ زماں مرزا، شاہجہاں مرزا کے چھوٹے بھائی تھے۔ اُن کی ولادت ۱۷ مئی ۱۹۱۳ کو ہوئی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کشمیری گیٹ دہلی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایچی سن کالج لاہور سے ڈپلومہ کی سند حاصل کی۔ اُنھیں شعروشاعری کا شوق بھی تھا اور وہ اپنے کلام پر اختر شیرانی سے اصلاح لیتے۔

نواب احمد بخش خان والئ فیروزپور جھرکا کے خلف اصغر اور نواب الٰہی بخش خان معروف کے بھتیجے نواب ضیاءالدین احمد خان نیرّ رخشاں اکتوبر ۱۸۲۱ء میں فیروزپور جھرکا میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۲۷ء میں ان کے والد کی وفات کے وقت اُن کی عمر صرف چھ سال تھی اس لئے لوہارو پرگنہ سے ملنے والی ان کی آمدنی کا حصہ خزانہ میں جمع

ہو جاتا تھا۔ بالغ ہونے کے بعد نواب ضیاء الدین احمد خان نے انگریزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ ان کو ریاست میں برابر کا شریک سمجھا جائے یا اس جاگیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن ان کے یہ دونوں مطالبات رد ہو گئے اور ۱۸۴۸ء میں یہ فیصلہ ہوا کہ ریاست کے نواب ان کے بڑے بھائی امین الدین احمد خان رہیں گے اور نواب ضیاء الدین احمد خان کو ۱۸۰۰۰/- روپے سالانہ ریاست سے وظیفہ ملتا رہے گا۔ بعد ازیں وہ لوہارو کو خیرباد کہہ کر مستقل طور پر دہلی میں مقیم ہو گئے اور یہیں پر ۲۷ جون ۱۸۸۵ کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی قبر مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی قدس سرہٗ کی درگاہ میں ان کی اپنی خریدی ہوئی کوٹھی مرزا بابر والی میں ہے۔

نواب ضیاء الدین احمد خان کے لئے تعلیم و تربیت کا گھر پر ہی معقول انتظام کیا گیا تھا۔ مولوی کریم اللہ جو حضرت مولانا شاہ عبدالقادر کے شاگرد رشید تھے، نے ان کو تفسیر و حدیث کا درس دیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ نے ادب اور فقہ کی تعلیم دی۔ فلسفہ اور منطق کی تعلیم مولانا فضل حق خیرآبادی سے حاصل کی۔ آپ کو اردو، فارسی کے علاوہ عربی اور ترکی زبان پر بھی عبور تھا۔ اردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ اردو میں رخشاں اور فارسی میں نیّر تخلص کا استعمال کرتے تھے۔ آپ تاریخ کہنے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ کتب بینی آپ کا شغف تھا۔ گو ان کا بہت بڑا کتب خانہ ۱۸۵۷ء میں غدر کی نظر ہو گیا لیکن بعد میں پھر انہوں نے اچھی اچھی کتب جمع کیں اور حکومت ہند کے سکریٹری مسٹر ایلیٹ جیسے مورخ نے تاریخ مرتب کرتے وقت ان کے کتب خانہ سے اچھا خاصا استفادہ کیا جس کا اعتراف انہوں نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔[۱۳] ۱۸۵۷ کے غدر سے پہلے کے کتب خانہ کے بارے میں غالب لکھتے ہیں۔

• ڈر کر عرض کرتا ہوں کہ بیس ہزار سے کم کی مالیت کا نہ ہوگا۔[۱۴]

نواب ضیاء الدین احمد خان کی تعلیم و تربیت میں غالب کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ وہ اپنے اس شاگرد پر بہت فخر کرتے تھے۔ ان کی مدح میں غالب نے فارسی میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔ غالب نے انھیں اپنی زندگی ہی میں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا اور انھیں سندِ خلافت

بھی لکھ کر دی۔ بعد ازیں خلیفہ دوم نواب علاؤالدین احمد خان نامزد ہوئے۔

نواب ضیاءالدین احمد خان نیر رخشاں کی شادی شرف الدولہ سہراب جنگ قاسم جان کے صاحبزادے مرزا قدرت اللہ خان کی صاحبزادی امتیاز زمانی سے ہوئی۔ جن کو حاجن بیگم بھی کہا جاتا تھا۔ ان کے دو بیٹے مرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب ۱۸۴۰ء میں اور نواب سعیدالدین احمد خان طالب ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے، ان کی ایک بیٹی معظم زمانی بیگم بھی تھی جن کی زین العابدین خان عارف سے شادی ہوئی تھی۔ جنہیں سابق صدر جمہوریۂ ہند فخرالدین علی احمد خاں کی بہنیں حمیدہ سلطان احمد اپنی کتاب خاندانِ لوہارو کے شعراء، جسے غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے جون ۱۹۸۱ء میں شائع کیا ہے، میں انھیں اپنی نانی تحریر کیا ہے۔

مرزا شہاب الدین احمد خان ثاقب بہت پڑھے لکھے، متین، فطین اور ذہین انسان تھے اور انتظامی قابلیت بھی رکھتے تھے جس کی بدولت انگریزی حکومت نے انھیں اعزازی طور پر دہلی کا مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ مگر زندگی نے ان کے ساتھ زیادہ دیر وفا نہ کی اور ان کا انتقال عنفوان شباب ہی میں مرزا غالب کے انتقال کے قریب دو ماہ بعد تپ دق کی بدولت ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء کو ۲۹ برس کی عمر میں ہوا۔

ثاقب ایک بہت اچھے شاعر تھے اور اپنے والد نواب ضیاءالدین ہی کی طرح مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ شہاب کی مناسبت سے غالب ہی نے ان کا تخلص ثاقب تجویز کیا۔

ثاقب کی شادی ان کے سوتیلے چچا نواب شمس الدین احمد خان کی نواسی سکندر جہان بیگم سے ہوئی۔ ان کے چار لڑکے مرزا شجاع الدین احمد خان تاباں، بہاءالدین احمد خان طلب، سراج الدین احمد خان سائل، ممتاز الدین احمد خان مائل اور ایک لڑکی اختر سلطان بیگم پیدا ہوئیں۔ سائل اور مائل نے ادبی کارزار میں نمایاں شہرت حاصل کی۔ تاباں کی شادی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم سے ہوئی اور ان کا انتقال ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہوا۔

سائل کی بیوی نواب ممتاز علی خان والی پٹودی کی دختر مولا بیگم تھیں لیکن ان سے انقطاع کے بعد دوسری شادی داغ کی لے پالک بیٹی لاڈلی بیگم سے ہوئی۔ بہاءالدین احمد خان طلب کی شادی نواب علاؤالدین احمد خان علائی کی سب سے بڑی صاحبزادی زبیدہ سلطان بیگم

ے ہوئی۔ اُن کا بھی اپنے والد کی مانند ۳۲ سال کی کم عمر میں ہی انتقال ہوا اور پسماندگان میں اپنی ایک صاحبزادی محمودہ سلطان بیگم کو چھوڑا جس کی شادی نواب مالیر کوٹلہ سر ذوالفقار علی خاں کے بہت ہی قریبی رشتہ دار سے ہوئی۔ اختر سلطان بیگم نواب سر امیر الدین احمد خاں فرخ مرزا والیٔ لوہارو کے عقد میں آئیں جن کا پڑپوتا نواب امین الدین احمد خان ثانی بعد میں نواب لوہارو بنا۔

مرزا سعید الدین احمد خاں طالبؔ نواب ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں کے چھوٹے فرزند تھے۔ ان کی پیدائش ۱۸۵۲ء میں ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت اور نہایت وضع دار انسان تھے۔ جو اپنی خوبصورتی کی بدولت یوسف ثانی کہلاتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت اس زمانے کے امیرزادوں کی طرح ہوئی۔ اُنھیں جہاں شعر و شاعری کا شوق تھا، وہیں اُنھیں فنون سپہ گری میں بھی مہارت حاصل تھی اور ان کے اصطبل میں نہایت عمدہ اور بہترین نسل کے گھوڑے موجود رہتے تھے۔ وہ بارہ یا چودہ سال کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے۔ پہلے پہل اپنے بڑے بھائی مرزا شہاب الدین احمد خان ثاقبؔ کو کلام دکھاتے تھے۔ پھر سالکؔ اور مجروحؔ کو کلام دکھانے لگے۔ مرزا غالبؔ کے پاس رہتے تھے۔ اس لئے اصلاح کے بعد ان کی نظروں سے بھی کلام گزرنا ضروری سمجھتے تھے۔ سالکؔ کے حیدرآباد اور مجروحؔ کے الور جانے کے بعد خواجہ الطاف حسین حالیؔ سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ ان کا زیادہ تر کلام حالیؔ ہی کی اصلاح سے ہو کر گزرا ہے۔

۱۸۷۵ء میں مرزا سعید احمد خان طالبؔ کو پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر اجرٹن نے اسسٹنٹ کمشنر مقرر کیا۔ لیکن ضیاء الدین احمد خان نیر رخشاں اپنے بیٹے کی اس ملازمت سے ناخوش تھے۔ اُنھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کا بیٹا کسی کی ملازمت کرے۔ تاہم طالبؔ نے دس سال تک نہایت خوش اسلوبی سے اس عہدہ پر فائز رہ کر خدمات انجام دیں۔ لیکن ۱۸۸۵ء میں باپ کی موت کے بعد اس عہدہ سے مستعفی ہو کر دہلی چلے گئے اور اپنے اسلاف کی جائداد کا انتظام ہاتھ میں لیا اور بعد میں دہلی انتظامیہ کمیٹی کے ممبر بھی نامزد ہوئے۔

طالبؔ کی شادی سید احمد شاہ نواب سردھنہ کی صاحبزادی بادشاہ بیگم سے

۱۸۷۳ء میں ہوئی لیکن اُن کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ان کی عمر شعر و شاعری اور گھوڑوں کی پرورش میں کٹی۔ بالآخر ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ کو اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا اور اُنھیں ان کی ذاتی کوٹھی میں ان کے والد کے پائنتی دفنایا گیا۔ یہ کوٹھی بہادر شاہ ظفر کے بھائی مرزا بابر نے بنوائی، جو ۱۸۶۸ء میں شاہی جائیداد کے ساتھ نیلام ہوئی تو اسے نواب ضیاءالدین احمد خان نے خرید لی۔ جس میں نواب موصوف کے علاوہ نواب امین الدین احمد خان' والاں میں نواب علائی اور طالب' تاباں، سائل' اس کے صحن میں دفن ہیں۔ طالب کے انتقال کے بعد ان کی بہن زمانی بیگم کو یہ کوٹھی ترکہ میں ملی۔ ان کی قبر بھی وہیں موجود ہے۔ زمانی بیگم کے بعد ان کی تین بیٹیوں محمد سلطان بیگم، فاطمہ سلطان بیگم اور رقیہ سلطان بیگم کے حصہ میں یہ خاندانی وراثت آئی۔

نواب شہاب الدین خاں ثاقب کے سب سے بڑے صاحبزادے مرزا شجاع الدین احمد خان تاباں، ایک اچھے شاعر تھے اور حسین علی خان شاداں سے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ اُنھوں نے دو دیوان مرتب کئے۔ ان کی اہلیہ باقر علی خاں کی بڑی صاحبزادی محمد سلطان بیگم عرف جندو بیگم تھیں لیکن وہ اولاد سے محروم رہے۔ ان کی وفات ۱۹۲۹ء میں ہوئی۔ ان کی قبر بھی خاندانی قبرستان کوٹھی مرزا بابر والی قطب صاحب میں ہے۔

تاباں کو شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ شطرنج کھیلنے کا بھی شوق تھا۔ حکیم اجمل خان حکیم عبدالمجید خان، نواب فیض احمد خان، خواجہ عبدالمجید، پنڈت امرناتھ ساحر وغیرہ کا شمار ان کے قریبی احباب میں ہوتا ہے۔ گو طبیعت میں لاابالی تھی تاہم بہت سخی تھے۔ ان کے بھائی سائل بھی شاعر تھے۔ ان دونوں بھائیوں کی شرکت کے بغیر ہر مشاعرہ ادھورا خیال کیا جاتا تھا۔

مرزا سراج الدین احمد خان سائل دہلوی ہنوز دس سال ہی کے تھے کہ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ وہ بہت ذہین تھے۔ علم و ادب کے گرا شدہ' رکھتے تھے اس لئے اپنے دادا نواب ضیاءالدین احمد خان نیر رخشاں کو بہت عزیز تھے۔ ان کی پرورش اتنے ناز و نعم سے ہوئی کہ دادا نے جیتے جی اُنھیں کسی چیز کا احساس نہ ہونے دیا۔ یہی وجہ تھی

کہ وہ علم وفن اور شعروادب کے ساتھ ساتھ حسن وجمال سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ عاقبت اندیش ماں نے بیٹے کے چال چلن کو دیکھتے ہوئے اسے شادی کی سنہری زنجیریں پہنادیں۔ان کی شادی اپنی چھوٹی بہن جو نواب ممتاز علی خان کے عقد میں تھیں، کی چھوٹی صاحبزادی سے کردی۔ سائل کا رجحان ایک تو پہلے ہی خالہ زاد کی طرف تھا اس لئے شادی کے بعد وہ اس کی ناز برداریوں میں پوری طرح مصروف ہوگئے۔ لیکن یہ ناز برداریاں زیادہ دیر نہ چل سکیں۔ان کے ایک پانچ سال کے بیٹے کی موت کے بعد ان میں اور زیادہ نفاق بڑھ گیا۔ سائل نے ایک اور شادی اپنے چھوٹے بھائی ممتاز الدین احمد خان کی بیوہ لاڈلی بیگم سے کرلی جوکہ نواب مرزا خان داغ دہلوی کی منہ بولی بیٹی تھیں۔ اس لئے انھیں ۲۰۰ روپے ماہانہ حیدرآباد سے اور ملنے لگے تھے جبکہ ان کا منصب پہلے تین سو روپے ماہانہ تھا۔ اس بیگم سے سائل کے تین بچے پیدا ہوئے۔ سب سے بڑی صاحبزادی قدسیہ بیگم تھیں اور پھر دو لڑکے مرزا قطب الدین احمد خان اور مرزا نظام الدین احمد خان تھے۔ قدسیہ بیگم کی شادی لاہور کے جج عبدالرب سے ہوئی جو عہدِ شباب ہی میں ایک بچہ چھوڑکر فوت ہوگئیں۔ نظام الدین احمد خان کا بھی جوانی ہی میں انتقال ہوا۔ مرزا قطب الدین احمد خان کی شادی اپنی بہن قدسیہ بیگم کی سوتیلی بیٹی سے ہوئی۔ ان کے تین بچے پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ غالب کی بساط کا آخری مہرہ اور کاشانۂ نیر کی آخری شمع، مرزا سراج الدین احمد خان سائل، بھی ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہوچکی تھی۔

حواشی

حوالہ ۱ "غالب اور انقلابِ ستاون" از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، سالِ اشاعت ۱۹۸۸ء ص ۲۱ - ۱۲۰ -

حوالہ ۲ ہریانہ اتہاسک سنہاولوکن، از کے۔سی۔یادو، ایس۔آر۔ پھوگٹ۔ ہریانہ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ۔ سالِ اشاعت ۱۹۹۱ء ص ۱۲

حوالہ ۳؎ "غالب" از غلام رسول مہر۔ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور۔ ص ۳۱
حوالہ ۴؎ "نقوشِ داغ" از ساحر ہوشیار پوری۔ ہریانہ اردو اکادمی۔ سال اشاعت ۱۹۹۲ء ص ۱۸۔
حوالہ ۵؎ "نقوشِ داغ" از ساحر ہوشیار پوری۔ ہریانہ اردو اکادمی۔ سالِ اشاعت ۱۹۹۲ء ص ۱۸۔
حوالہ ۶؎ "تلامذۂ غالب" از مالک رام۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی، بارِ دوم ۱۹۸۴ء ص ۴۴
حوالہ ۷؎ "نقوشِ داغ" از ساحر ہوشیار پوری۔ ہریانہ اردو اکادمی۔ سال اشاعت ۱۹۹۲ء ص ۱۳۔
حوالہ ۸؎ نقوشِ داغ۔ از ساحر ہوشیار پوری، ہریانہ اردو اکادمی۔ سال اشاعت ۱۹۱۲ء ص ۱۸۔
حوالہ ۹؎ تلامذۂ غالب۔ از مالک رام۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی بارِ دوم ۱۹۸۴ء۔ ص ۴۴
حوالہ ۱۰؎ آبِ حیات، از محمد حسین آزاد دہلوی تلخیص و مقدمہ سید احتشام حسین۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی مارچ ۱۹۷۲ء۔ ص ۱۳۳۔
حوالہ ۱۱؎ خاندان لوہارو کے شعراء۔ از حمیدہ سلطان۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ص ۱۰۴
حوالہ ۱۲؎ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۱۰۵
حوالہ ۱۳؎ تلامذۂ غالب۔ از مالک رام۔ مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، بارِ دوم ۱۹۸۴ء ص ۵۳۷
حوالہ ۱۴؎ خاندانِ لوہارو کے شعراء" از حمیدہ سلطان" غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔ سنِ اشاعت جون ۱۹۸۱ء۔ ص ۱۲۷،

مرزا غالبؔ کی پنشن کا مقدمہ

مرزا غالبؔ کی پنشن کا مقدمہ اُن کی زندگی کا سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اس نے اُن کی سیرت و شخصیت ہی کو نہیں اُن کے دستور اقدار کو، اجتماعی رشتوں کو حتیٰ کہ اُن کی شاعری کو بھی بہت خاموشی سے گہرائی تک متاثر کیا ہے۔

پہلے بہ طور تمہید، یہ دیکھا جائے پنشن کیوں تھی اور کیا تھی، اس کا تنازعہ کیا تھا!

مرزا غالبؔ کہتے ہیں کہ اُن کے دادا قوقان بیگ خاں شاہ عالم کے عہد (۱۱۷۳ھ / ۱۷۵۱ء سے ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء تک)[1] میں سمرقند سے ہجرت کر کے دلی آئے تھے۔ ان کے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں میں سے ہمیں دو بیٹوں کے نام معلوم ہیں عبداللہ بیگ عرف مرزا دولہا اور نصراللہ بیگ۔ یہ بہ قول غالبؔ دلی ہی میں پیدا ہوئے۔

مالک رام کا بیان ہے کہ قوقان بیگ غالبؔ کے پردادا تھے اور وہ محمد شاہ کے زمانے میں (۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۹ء سے ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء تک) پہلے لاہور آئے وہاں نواب معین الملک عرف میر منّو کی سرکار سے وابستہ ہوئے پھر دلی آکر ذوالفقار الدولہ نجف خاں (وفات ۲۶ اپریل ۱۷۸۲ء مطابق ۱۲ ربیع الثانی ۱۱۹۶ھ)

---

[1] عین ممکن ہے کہ اس عہد سے پہلے آئے ہوں، میر منو معین الملک کے ملازم رہے تو یقیناً یہ زمانہ محمد شاہ کا ہوگا۔

کے متوسل ہو گئے تھے۔ شاہ عالم کے عہد میں انھیں نقارہ و نشان کے ساتھ پچاس سواروں کا دستہ ملا۔ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں پرگنہ پہاسو عطا ہوا تھا۔

غلام حسین خاں کمیدان بھی نجف خاں کے متوسل تھے۔ اسی لیے عبداللہ بیگ کا رشتہ اُن کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوا' اور اسی لیے عبداللہ بیگ دہلی سے نکل کر آگرے میں جا بسے تھے۔

اپنے والد کے بارے میں مرزا غالب کا بیان ہے کہ وہ لکھنؤ گئے' وہاں نواب آصف الدولہ کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ "بعد چند روز" حیدرآباد جا کر نواب نظام علیخاں کے دربار میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ وہاں "کئی برس" رہنا ہوا۔ وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ عبداللہ بیگ وہاں سے الور آگئے اور راؤ بختاور سنگھ کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ وہاں کسی لڑائی میں مارے گئے (غالباً ۱۸۰۲ء میں) راج گڑھ (راجستھان) میں دفن ہوئے۔

کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست

در خاک راج گڑھ پدرم را بود مزار

مرزا عبداللہ بیگ کی وفات کے بعد اُن کے چھوٹے بھائی نصراللہ بیگ نے چھوٹے بچوں کی پرورش اور نگرانی کی ذمہ داری سنبھالی۔ عبداللہ بیگ کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔

۱۔ اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۲۔ یوسف علی خاں

۳۔ چھوٹی خانم جو مرزا اکبر بیگ سے منسوب ہوئیں

عبداللہ بیگ راؤ بختاور سنگھ کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے اس لیے والی الور نے اُن کی اولاد کی پرورش کے لیے دو گانو اور کسی قدر روزینہ مقرر کر دیا تھا' مگر اس کی زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہوتی۔

مرزا نصراللہ بیگ مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد (آگرہ) کے صوبیدار (یا قلعہ دار) تھے۔ جب ۱۸۰۳ء میں جارج لارڈ لیک (وفات ۲۰ فروری ۱۸۰۸ء)

نے آگرہ کا محاصرہ کیا تو نصر اللہ بیگ نے ہتھیار ڈال دیے اور شہر کو لارڈ لیک کے حوالے کر دیا۔ اس کے صلے میں لارڈ لیک نے انھیں چار سو سواروں کا بریگیڈیر بنا دیا اور ایک ہزار سات سو روپے اُن کی تنخواہ مقرّر کی۔

نصر اللہ بیگ نے مرہٹہ سردار ہولکر کی فوج سے مقابلہ کر کے بھرت پور کے نواح میں دو پرگنے سونک (بروزن ٹونک) اور سونسا (بروزن دھونسا) چھین لیے تھے۔ جنرل لیک نے ۲۱ ستمبر ۱۸۰۵ء کو یہ دونوں پرگنے "بہ طور استمرار" انھیں عطا کر دیے جن کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ اس پر بختاور سنگھ والی الور (وفات ۱۸۱۵ء) نے لوہارو کا علاقہ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا تھا۔

اس کو ابھی دس گیارہ مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایک دن نصر اللہ بیگ ہاتھی سے گر پڑے، سخت زخمی ہوئے اور کچھ دنوں بیمار رہ کر ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء میں انتقال کر گئے۔

اب مرزا عبد اللہ بیگ کے یتیم بچے اپنے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی نگرانی میں آ گئے۔ انگریزوں نے مرزا نصر اللہ بیگ کی جاگیر ضبط کر لی اور اس کے عوض اُن کے وارثوں کی پنشن مقرّر کر دی۔ یہ پنشن بہت زیادہ ہوتی مگر غالب کے نصیب میں صرف ۷۵۰ روپے سالانہ ہی آئے۔ بقایا کے لیے انھوں نے ساری زندگی تگ و دو میں گذاری مگر انصاف حاصل نہ کر سکے۔

اپنی ننھیال میں غالب کا بچپن ناز و نعمت میں بسر ہوا۔ ۱۲۲۵ھ / ۱۸۱۰ء میں جب اُن کی عمر صرف ۱۳ برس تھی، اُن کی شادی نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکہ کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش معروف (وفات ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸-۲۹ء) کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے کر دی گئی جو اُس وقت صرف گیارہ برس کی تھیں۔

شادی کے بعد غالب آگرے سے دہلی میں آ کر بس گئے۔ "در ایام جوانی

۱؎ یہ دونوں پرگنے متھرا سے سولہ (۱۶) میل کے فاصلے پر کمھیر جانے والی سڑک پر واقع تھے۔
مرزا یوسف علی بیگ ولادت ۱۲۱۴ھ / ۱۷۹۹-۱۸۰۰ء وفات ۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ / ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء

چناں کہ اُفتادِ دانی“ انھوں نے عنفوانِ شباب کا زمانہ رنگ رلیوں میں گذارا۔ کچھ مالی امداد ننھیال سے، کچھ سُسرال سے مل جاتی ہوگی۔ مگر وہ اُن کی شاہ خرچی کے لیے کافی نہ ہوتی تھی، اِس لیے قرض لے کر کام چلاتے رہے۔ کلکتہ میں عرضی دعویٰ داخل کرتے وقت اُنھوں نے قرض کی مقدار بیس ہزار روپے لکھی تھی جو بعد کو بڑھ کر بیس چالیس ہزار روپے تک جا پہنچی ہوگی۔

لارڈ لیک نے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو ایک دستاویز لکھ کر مرزا نصر اللہ بیگ کے وارثوں کی پنشن نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکا کی سرکار سے واجب الادا کر دی تھی۔ اس کی رو سے نصر اللہ بیگ کے وارثوں کو دس ہزار سالانہ ملنے چاہیے تھے۔ نصر اللہ بیگ لاولد فوت ہوئے تھے۔ اُن کے قانونی وارث مرزا غالبؔ اور اُن کے بھائی بہن ہی تھے۔ ان بچّوں کی دادی بھی اس وقت زندہ تھیں۔

احمد بخش خاں انگریزوں کے وفادار تھے۔ انھوں نے بھرت پور کی جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اور جنرل فریزر (FRAZER) کو دشمنوں کے نرغے سے نکال لائے تھے۔ فریزر زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا، مگر اُس نے احمد بخش خاں کو پروانۂ خوشنودی لکھ کر دے دیا تھا جس سے انھیں فخر الدولہ دلاور الملک رستمِ جنگ کا خطاب اور فیروز پور جھرکا میں جاگیر مل گئی تھی۔ انگریزوں میں اُن کا رسوخ بھی بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اعلیٰ حکام کی دعوتیں اور خاطر مدارات خوب کرتے رہتے تھے۔

احمد بخش خاں نے یہ چال چلی کہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کے شقّے کے صرف ۳۴ دن بعد ۷ جون ۱۸۰۶ء کو ایک اور دستاویز فارسی میں لکھ کر اُس پر لارڈ لیک سے دستخط کرا لیے اور مُہر بھی لگوالی تھی۔ اس میں پنشن کی رقم دس ہزار کی جگہ پانچ ہزار لکھی ہوئی تھی۔ یہ دستاویز سرکاری رکارڈ میں کہیں موجود نہیں تھی، احمد بخش خاں اسے اپنے پاس دبائے بیٹھے رہے اور اس کی رُو سے پانچ ہزار سالانہ تقسیم کرتے رہے۔ اس دستاویز کا غالبؔ کو بھی علم نہیں تھا۔ پنشن کی تقسیم میں غیر منصفانہ رویّے

کے بارے میں غالب احمد بخش خاں پر زیادہ زور بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے کہ سسرال کا معاملہ تھا۔ دوسرے وہ ایک ریاست کے نواب تھے اور یہ خراب و خستہ نرے شاعر۔ غالب اکثر خطوط لکھ کر اور کبھی ملاقات کر کے اُن سے پنشن کے بارے میں احتجاج کرتے تو دم دلاسے دے کر انھیں خاموش کر دیا کرتے تھے۔

پانچ ہزار سالانہ میں بھی احمد بخش خاں نے اور کٹوتی یوں کر دی کہ نصر اللہ بیگ خاں کے ایک ملازم (یا دُور کے نسبتی رشتہ دار کہہ لیجیے) خواجہ حاجی (وفات ۱۸۲۵ء) کو بھی وارثوں کی صف میں شامل کر لیا اور دو ہزار روپے سالانہ اُس کے نام منتقل کر دیے۔ اب صرف تین ہزار ہی باقی بچے اُن کو یوں تقسیم کیا۔

اسد اللہ خاں اور مرزا یوسف کو ۱۵۰۰ روپے
نصر اللہ کی والدہ اور دو بہنوں کو ۱۵۰۰ روپے

غالب جب بھی اپنی پنشن میں اضافے کی درخواست کرتے تھے۔ احمد بخش خاں یہ حقیقت نہ بتاتے تھے کہ انھوں نے ، جون ۱۸۰۶ء کو لارڈ لیک سے دوسرا رقعہ لکھوا کر رکھ لیا تھا۔

۱۸۰۶ء میں غالب ۹ برس کے اور مرزا یوسف ۷ برس کے تھے۔ نوجوانی میں اتنا ہوش کہاں تھا کہ تدبیر معاش میں سر کھپاتے۔ جب قرض خواہوں نے ناک میں دم کر دیا تب آنکھیں کھلیں۔

قرض کی پیتے تھے مَے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

اور وہ رنگ لائی۔ ایک رات کو بھیس بدل کر دو تین ملازموں کو ساتھ لے کر دہلی سے نکلے اور فیروزپور جھرکا میں نواب احمد بخش خاں کے پاس پہنچے۔ یہ اُن کے بڑھاپے کا زمانہ تھا۔ اکتوبر ۱۸۲۶ء میں انھوں نے اپنی ریاست کو بیٹوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں (نواب مرزا داغ کے والد) کو

فیروز پور کی جاگیر دے دی' لوہارو کا علاقہ نواب علاء الدین احمد خاں علائی اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں[1] کے حصے میں آیا' خود احمد بخش خاں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ غالب نے اُن سے اپنی پریشانی' تنگدستی اور قرض خواہوں کے شدید تقاضوں کا رونا رویا تو احمد بخش کبھی رونے لگے اور طفل تسلیوں سے غالب کو بہلاتے رہے۔ جب غالب نے یہ احتجاج کیا کہ خواجہ حاجی مرزا نصر اللہ بیگ کے وارث کیسے بن گئے تو احمد بخش نے کہا کہ میں لارڈ لیک کے روبرو انھیں نصر اللہ بیگ کا رشتہ دار کہہ چکا ہوں اب اس کی تردید کروں گا تو میں جھوٹا بنوں گا۔ یہ عذر گناہ بدتر از گناہ کی مثال ہے۔ جھوٹ تو وہ نہ صرف بول چکے تھے بلکہ اسے دستاویزی حیثیت دے چکے تھے۔ ۱۸۰۶ء کے جن کاغذوں میں کبھی نصر اللہ بیگ کے وارثوں کی کفالت کا ذکر آیا ہے اُن میں "خواجہ حاجی وغیرہ" لکھا ہوا ہے یعنی نصر اللہ بیگ کے بھتیجے "وغیرہ" میں شامل کیے گئے تھے۔

انھوں نے غالب سے کہا کہ کچھ دن اور صبر کرلو' خواجہ حاجی کے مرنے کے بعد ان کی پنشن تمھارے نام جاری کردوں گا' مگر یہ بھی محض حیلہ سازی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں خواجہ حاجی مر گئے تو یہ دو ہزار روپے ان کے دو بیٹوں خواجہ بدر الدین عرف خواجہ امان (مترجم بوستان خیال) (ولادت ۱۸۱۱ء وفات ۱۸۷۹ء) اور خواجہ شمس الدین عرف خواجہ جان کی طرف منتقل کر دیے گئے' گویا عملاً یہ ہوا کہ اسد اللہ خاں اور مرزا یوسف جو نصر اللہ خاں کے حقیقی برادر زادے اور شرعی وارث تھے اُنھیں تو ساڑھے سات سو روپے سالانہ ملتے رہے اور خواجہ حاجی کے بیٹے خواجہ امان اور خواجہ جان کو ایک ایک ہزار روپے سالانہ۔

خواجہ حاجی کے سلسلے میں غالب بار بار لکھتے رہے کہ ان کا ہمارے خاندان سے کوئی نسبی تعلق نہیں۔ وہ نصر اللہ بیگ کے رسالے میں بارگیر (سائیس)

---

[1] وفات ۲۷ جون ۱۸۸۵ء (۱۳ رمضان ۱۳۰۲ھ)

ضمیمہ ۱

شجرہ خاندان

مرزا عالم جان — مرزا عارف جان — مرزا قاسم جان

احمد بخش خاں (۱۷۶۵ - ۱۸۲۷)

نبی بخش خاں

الٰہی بخش معروف (ف ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء)

دختر (منسوب بہ نصر اللہ بیگ)

محمد علی

بنیادی بیگم (منسوب بہ غلام حسین مسرور)

امراؤ بیگم (ف ۱۸۷۰ء) (منسوب بہ مرزا غالب)

علی بخش

غلام فخر الدین (زوجہ عزیز النسا بنت مرزا یوسف)

(زوجہ اولیٰ سے)

ابراہیم علی خاں — نواب بیگم — جہانگیرہ بیگم — شمس الدین خاں (مصلوب ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء)

(زوجہ ثانیہ سے)

امین الدین خاں آف لوہارو — علاء الدین علائی — ماہ رخ بیگم — بادشاہ بیگم

حیدر حسین خاں

زین العابدین عارف (متوفی جمادالثانیہ ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء)

باقر علی خاں کامل — حسین علی خاں شاداں

ضمیمہ ۲

وارثان مرزا نصر اللہ بیگ
(۱۸۰۶ء میں نصر اللہ بیگ کی وفات کے وقت)

والدہ نصر اللہ بیگ — خواہر

والدہ نصر اللہ بیگ کی اولاد:
- عبد اللہ بیگ (ف ۱۸۰۶ء)
  - مرزا اسد اللہ غالب (ف ۱۸۶۹ء)
  - مرزا یوسف
    - عزیز النساء
  - مرزا عباس بیگ
- نصر اللہ بیگ (ف ۱۸۰۶ء)
- دختر
- دختر
- دختر

خواہر:
- دختر (منسوب بہ خواجہ مرزا)
  - خواجہ حاجی (ف ۱۸۲۵ء)
    - بدر الدین خواجہ امان
    - شمس الدین خواجہ جان
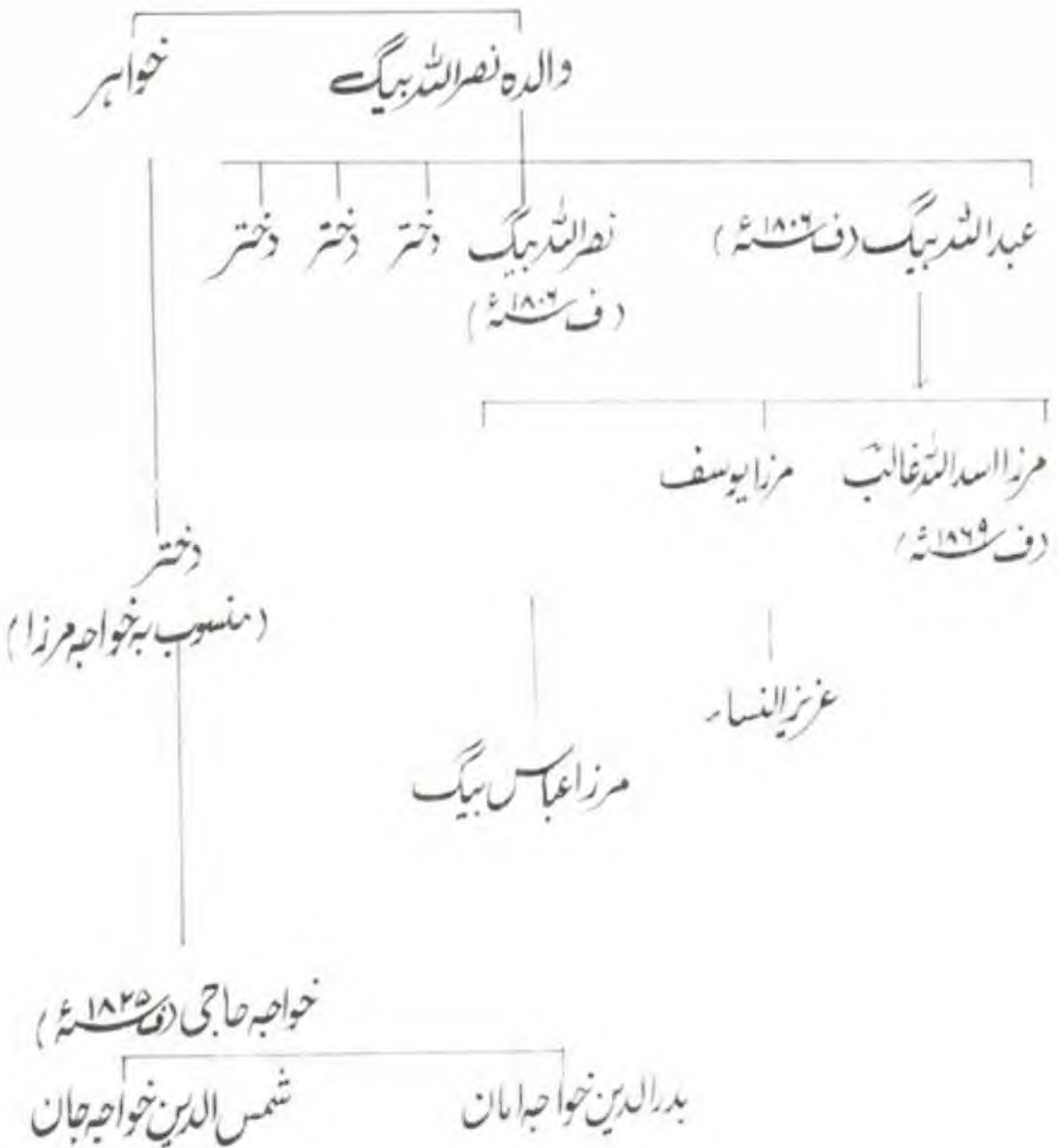
کے طور پر ملازم تھا۔ خواجہ حاجی کا باپ خواجہ مرزا بھی قوقان بیگ کا سائیس تھا۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ خواجہ حاجی کے بیٹے خواجہ امان کی مترجمہ کتاب بوستان خیال کی پہلی جلد "حدائق الانظار" کے دیباچے میں (اکمل المطابع دہلی ۱۲۹۲ھ) انھیں اپنا "بھتیجا اور پیارا بھتیجا" بھی لکھتے ہیں۔ غلام غوث بے خبر کے نام اپنے خط میں کہتے ہیں:
"میرے ایک رشتے کے بھتیجے نے بوستان خیال کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔"

قوقان بیگ کی بیوی کی ایک بیوہ بہن تھیں اُن کی بیٹی سے خواجہ مرزا کا نکاح کر دیا گیا تھا، خواجہ حاجی اس طرح مرزا غالب کی دادی کی بہن کے نواسے تھے۔ شرعی اعتبار سے یہ رشتہ وارث بننے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ غالب نے وراثت کی شرعی تقسیم کا دعویٰ نہیں کیا، ورنہ اُس وقت اس کا فیصلہ شرعی اعتبار سے ہوسکتا تھا۔ (دیکھیے ضمیمہ ۲ نصراللہ بیگ کے وارثوں کا شجرہ)

نصراللہ بیگ کی وفات کے بعد احمد بخش خاں نے اُن کی والدہ (یعنی مرزا غالب کی دادی) کے لیے ۱۵۰ سو روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا۔ جو اُن کے انتقال کے بعد اُن کی بڑی بیٹی کو ملتا رہا۔ اس میں سے وہ اپنی دو چھوٹی بہنوں کو بھی حصہ دیتی تھیں۔ اپنا گھریلو سامان بیچ کر بھی گذارا کر رہی تھیں اور مقروض بھی ہوگئی تھیں۔

نصراللہ بیگ کی وفات کے وقت اُن کے بھتیجے مرزا نوشہ اور مرزا یوسف نابالغ تھے۔ اس کا فائدہ خواجہ حاجی نے اٹھایا، وہ مرزا نصراللہ کا سب ساز و سامان اور سواروں کا دستہ لے کر فیروز پور جھرکا میں احمد بخش خاں کے پاس چلا گیا۔ انھوں نے اسے اپنی جاگیر میں ملازم رکھ لیا، اور وارثان نصراللہ بیگ میں شامل کر کے پانچ ہزار میں سے دو ہزار روپے سالانہ اُس کے نام مقرر کر دیے۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ مرزا نصراللہ بیگ احمد بخش خاں کے حقیقی بہنوئی تھے۔ (دیکھیے ضمیمہ نمبر ۱)

خواجہ حاجی کے مرنے کے بعد جب پنشن اُس کے دونوں بیٹوں کی طرف

منتقل ہوگئی تو مرزا غالب کے لئے پانی سر سے اونچا ہوگیا۔ یہ انگریزی محاورے کے مطابق "اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا" تھا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ کلکتے جاکر گورنر جنرل سے فریاد کریں۔ یہ سفر طویل بھی تھا اور انھیں ایک مدّت تک دہلی سے باہر پردیس میں رہنا تھا، مصارف سفر کے لیے انھوں نے مزید قرض لیا، کچھ گھر کا سامان بھی بیچا ہو تو عجب نہیں، کیونکہ انھیں توقع تھی کہ انصاف ملے گا تو ۲۰۔۲۲ برس کے بقایاجات بھی ہزاروں روپے کی صورت میں ملیں گے جس سے سب قرض چکا دیا جائے گا۔

مرزا غالب اگست ۱۸۲۶ء میں دو تین خدمت گاروں کو ساتھ لے کر دہلی سے بھیس بدل کر نکلے تھے۔ اس وقت کا قانون یہ تھا کہ قرض خواہ کسی معزز آدمی کو اس کے گھر سے نہیں پکڑ سکتے تھے، وہ باہر کہیں مل جائے تو گرفتار ہو سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر قرض خواہوں کو معلوم ہوگیا کہ دہلی چھوڑ کر جا رہے ہیں تو وہ اسے فرار ہونا سمجھیں گے اور جانے نہ دیں گے۔

غالب سب سے پہلے اتمامِ حجت کے لیے فیروز پور جھرکا جاکر نواب احمد بخش خاں سے ملے اور اپنا دکھڑا رویا، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔

جنرل آکٹرلونی (DAVID BARNET OCTAR LONI) (ولادت ۱۲ فروری ۱۷۵۸ء وفات ۱۸۲۵ء) کے بعد سر چارلس مٹکاف (SIR CHARLES METCALF) (ولادت ۳۰ جنوری ۱۷۸۵ء وفات ۵ ستمبر ۱۸۴۶ء) دہلی کے ریزیڈنٹ ہوئے تھے۔ احمد بخش خاں نے غالب کو دلاسا دیا کہ وہ چارلس مٹکاف سے ان کا تعارف کرا دیں گے اور نصراللہ بیگ مرحوم کی خدمات سے بھی انھیں آگاہ کریں گے۔ غالب نے اپنے عرضی دعوے میں لکھا تھا[1]

---

[1] مرزا غالب کے مقدمہ پنشن سے متعلق بیشتر دستاویزیں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں محفوظ ہیں۔ کچھ کاغذ انڈیا آفس لندن میں بھی ہیں۔ ان سب کو ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے ایڈٹ کرکے ۱۹۹۷ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع کر دیا ہے۔ ہم نے اس مضمون میں زیادہ تر استفادہ اسی کتاب سے کیا ہے۔

"جنرل آکٹرلونی کا انتقال ہوگیا اور سر چارلس مٹکاف کی آمد کا اعلان ہوا۔ احمد بخش خاں نے مجھ سے بہت سے وعدے کیے اور کہا، خاموش اور مطمئن رہو جب سر چارلس مٹکاف آئیں گے تو میں تمھارا اُن سے تعارف کراؤں گا۔ تفصیل سے تمھارا مقدمہ اُن کے سامنے پیش کروں گا۔ اور بتاؤں گا کہ حکومت کے ساتھ تمھارے چچا کے تعلقات و مراسم کی نوعیت کیا تھی، اور مستحق کو اس کا حق دلاؤں گا۔ میں تم پانچوں کے نام حکومت کی جانب سے سند بنواؤں گا تاکہ میرے انتقال کے بعد میرے بچے تمھاری گذر اوقات کے لیے مقررہ تن خواہ ادا کرنے میں نہ تو کوئی لیت و لعل کرسکیں اور نہ ہی کوئی دشواری پیدا کرسکیں۔

موصوف (سر چارلس مٹکاف) کی آمد کے بعد، چونکہ بھرت پور کا معاملہ اُن کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا، اور وہ راجا کی امداد اور بھرت پور میں باغیوں کی گوشمالی کی جانب اپنی ساری توجہ مبذول کیے ہوئے تھے اس لئے احمد بخش خاں نے کہا کہ مجھے اس سفر میں اُن کے ساتھ جانا چاہیئے۔ باوجودیکہ میں اس زمانے میں اپنے بھائی کی علالت اور قرض خواہوں کے سخت تقاضوں کی وجہ سے اذیت ناک پریشانی میں مبتلا تھا اور بالکل اس سفر کے قابل نہ تھا، اس امید پر کہ موصوف کی طرف سے جو فرض منصبی مجھ پر عائد ہوتا ہے وہ ادا ہو جائے گا میں نے اپنے بھائی کو بخار اور ہذیانی حالت میں چھوڑا، چار آدمی اُسکی دیکھ بھال اور نگہداشت پر مقرر کیئے، کچھ قرض خواہوں سے وعدے وعید کرکے انھیں راضی کیا دوسروں سے چھپتا چھپاتا اور بھیس بدل کر، کسی قسم کی سہولت کے بغیر بہ مشکل تمام احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور روانہ ہوگیا۔

بھرت پور کی فتح کے بعد میں نے احمد بخش خاں سے بات کی، تاہم انھوں نے اب بھی سر چارلس مٹکاف سے میرا تعارف نہیں کروایا۔ اسی زمانے میں اُن کے چہرے پر فالج کا حملہ ہوا لیکن ڈاکٹر ڈنکن (DUNCON) کے بہترین علاج سے بالآخر انھیں شفا حاصل ہوگئی اور وہ فیروز پور واپس آگئے۔ سر چارلس مٹکاف نے اگرچہ فیروز پور میں تین روز قیام کیا۔ اور میں تینوں دن روزانہ احمد بخش خاں سے التجائیں کرتا رہا، لیکن انھوں نے میرا تعارف نہ کرانا تھا، نہ کروایا۔" (پولیٹکل روداد ۲ مئی ۱۸۲۸ء

اسد اللہ خاں غالب کا عرضی دعوی مورخہ ۲۸- اپریل ۱۸۲۸ء مشمولہ "غالب کی خاندانی پنشن اور دیگر اُمور" مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اسلام آباد ۱۹۹۷ء)

اسی زمانے میں گورنر جنرل کے آنے کی خبر گرم ہوئی تو غالب نے سوچا کہ سر چارلس مٹکاف ان کے استقبال کے لیے کانپور ضرور آئیں گے، میں بجائے دہلی کو جانے کے کانپور جا کر مٹکاف سے ملوں اور اُن کے قافلے کے ساتھ دہلی واپس آؤں، راستے میں موقع پا کر اُن سے اپنی پریشانی خود بیان کروں۔

مٹکاف سے بھی امید بر آری نہ ہوسکی تو غالب آخری درجے میں مایوس ہو گئے اور انھیں سوائے مقدمہ بازی کے دوسرا کوئی راستہ اس مسئلے کو حل کرنے کا نظر نہیں آیا۔

غالب فرخ آباد ہوتے ہوئے کانپور گئے تھے، وہاں بیمار پڑ گئے۔ نہایت کمزوری کے عالم میں انھوں نے کانپور سے لکھنؤ کی راہ لی جہاں ان کا قیام تقریباً ۹ ماہ تک رہا اس میں پانچ ماہ اور چند روز بیماری میں بھی گذرے۔ نواب وزیر یا کسی دوسرے امیر سے غالباً اُن کی ملاقات نہ ہوسکی۔

لکھنؤ سے انھوں نے بندیل کھنڈ (باندہ) کا سفر کیا جہاں کے رئیس نواب ذوالفقار علی خاں تھے۔ انھوں نے اس سفر کے لیے غالب کو کچھ مالی امداد

سمجھی یقیناً دی ہوگی۔ باندے میں وہ چھ ماہ تک مقیم رہے یہاں سے گھوڑے پر سوار ہو کر کلکتے کا سفر شروع کیا۔ بنارس میں قیام کرتے ہوئے مرشد آباد کے راستے سے ہو کر ۱۹۔ فروری ۱۸۲۸ء یا اس سے ایک دو دن کے بعد کلکتہ میں وارد ہوئے۔ مرشد آباد میں انھیں نواب احمد بخش خاں کے انتقال کی خبر بھی مل گئی تھی۔

۲۸، فروری ۱۸۲۸ء کو انھوں نے اپنا عرضی دعویٰ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی عدالت میں داخل کیا جس کا خلاصہ یہ تھا۔

غالب کے عرضی دعوے کا خلاصہ

(۱) نواب احمد بخش خاں کو تین لاکھ سالانہ کی جاگیر اس شرط پر دی گئی تھی کہ وہ ۲۵ ہزار روپیہ سالانہ حکومت برطانیہ کے خزانے میں جمع کرتے رہیں گے۔
(۲) نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد اُن کے پچاس سواروں کے دستے کا خرچ اور اُن کے وارثوں کا وظیفہ بھی اس رقم سے متعلق کر دیا گیا تھا۔
(۳) احمد بخش خاں نے وہ سوار دستہ تحلیل کر دیا اور وارثوں کو دس ہزار سالانہ کی بجائے صرف پانچ ہزار سالانہ ہی دیے۔ اس میں بھی خواجہ حاجی کو اُن کا وارث بنا کر دو ہزار روپیہ سالانہ کا حصہ دار کر دیا۔ اُس کا نصراللہ بیگ سے کوئی نسبی رشتہ نہ تھا۔
(۴) نصراللہ بیگ کے حقیقی ورثا کے حصے میں صرف تین ہزار سالانہ ہی آئے۔ ان میں سے آدھے نصراللہ بیگ کی والدہ اور تین بہنوں کو اور آدھے ہم دونوں بھائیوں کو دیئے باقی وارثوں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے خاندان کا ملازم میرے ساتھ برابر کا شریک ہو۔

(۵) احمد بخش خاں نے پچاس سواروں کا دستہ بھی تحلیل کر دیا، اُس کے لئے جو رقم دی گئی تھی وہ برطانوی خزانے میں جمع ہونی چاہئے۔

(۶) وظیفے کی مقدار مقرر کرنے کے لئے حقیقی وارثوں کی از سرِ نو تحقیق کی جائے، ہر ایک وارث کو علیحدہ وثیقہ ملے اور اس کا وظیفہ سرکاری خزانے سے ادا کیا جائے۔ مجھے ان سب حصہ داروں کا نگراں بنا کر امتیازی حیثیت دی جائے۔

(۷) نصر اللہ بیگ کی جاگیر کا احمد بخش خاں سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے وظیفہ سرکاری خزانے سے ادا ہونا چاہئے۔

اُس وقت فارسی شعبے میں (ANDREW STERLING) سکریٹری تھے[۱] غالب اُن سے ملے۔ ملاقات دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ اسٹرلنگ نے غالب کے عرضی دعوے کا انگریزی میں ترجمہ کرایا یا خود کیا اور گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کے سامنے پیش کیا۔ وہاں سے حکم ہوا کہ یہ درخواست پہلے دہلی میں برطانوی ایجنٹ کے دفتر میں دی جائے اور ایڈورڈ کولبروک[۲] (EDWARD COLEBROOKE) کی معرفت گورنر جنرل کے دفتر میں آئے۔ غالب نے دہلی میں اپنے وکیل ہیرا لال کو لکھا کہ وہ اس عرضی دعوے کو ایجنٹ کے دفتر سے بھجوائیں۔

لارڈ لیک کا دستخط کردہ دوسرا شقہ (۷، جون ۱۸۰۶ء) جس کی رو سے احمد بخش خاں پنشن کی رقم آدھی ادا کرتے تھے، اُسے غالب "جعلی" بتاتے تھے کیونکہ اُس کا مثنیٰ کسی سرکاری رکارڈ میں موجود نہیں تھا۔

چونکہ احمد بخش خاں کا انتقال مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا، مدعا علیہ اب اُن کے بیٹے نواب شمس الدین خاں تھے۔ اُن کے نمائندے

---

[۱] ولادت ۱۷۹۳ء وفات ۲۳ مئی ۱۸۳۰ء

[۲] یہ ۱۸۲۹ء تک دہلی میں ریزیڈنٹ رہے

کلکتے میں بھی موجود ہوں گے۔ دہلی کے برطانوی ایجنٹ سے بھی اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ نواب شمس الدین خاں یا اُن کے اہلکاروں نے ایجنٹ کے دفتر سے جو رپورٹ کلکتہ کو بھجوائی وہ غالب کے خلاف ہی تھی۔

کلکتے میں مرزا افضل بیگ[1] بھی دربار دہلی کے سفیر کی حیثیت سے مامور تھے۔ یہ خواجہ حاجی کے بیٹوں کا ماموں تھا۔ اس نے نواب شمس الدین خاں کی وکالت کرتے ہوئے جواب دعوی داخل کیا تو اُس میں غالب کو مالیخولیا کا مریض (LUNATIC) بتایا۔

"اُن میں سے ایک یعنی مرزا یوسف پاگل ہے اور شریعت کا مکلّف نہیں ہے' اور دوسرے کا مزاج اکثر و بیشتر قمر کے زوال و کمال کے ساتھ اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے۔ عین ممکن ہے یہ عرضی جو خاندان اور عزیزوں کی رسوائی اور ذلّت کا مرقع ہے۔ آثار قمر کے غلبے کے موقع پر تحریر کی گئی ہو۔"

اے اسٹرلنگ (A. STERLING) سکریٹری شعبہ فارسی نے ۱۳۔ مارچ ۱۸۲۹ء کو مراسلہ (J. E. COLEBROOKE) ریزیڈنٹ دہلی کو لکھا کہ اسد اللہ خاں کی درخواست کی چھان بین کریں۔ غالب کے وکیل نے کولبروک کا ۱۷۔ اپریل ۱۸۲۹ء کا خط بھیجا اس پر غالب نے ایک اور درخواست اینڈریو اسٹرلنگ کو دی جس میں چار دفعات کی تحقیق طلب کی تھی۔

(۱) جنرل لیک کی رپورٹ جو ۱۸۰۵ء کے آخر یا ۱۸۰۶ء کے شروع میں کانپور سے کلکتہ پہنچی تھی اور احمد بخش خاں کے حوالے کی گئی تھی اُس کا نصر اللہ بیگ کے وارثوں کو علم نہیں۔

---

[1] یہ غالب کے بہنوئی مرزا اکبر بیگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ اکبر شاہ ثانی کی طرف سے کلکتہ میں سفیر تھے۔ ۱۸۳۲ء سے کچھ پہلے انتقال ہوا۔ ان کے خاندانی حالات کے لیے دیکھیے "کارنامہ سروری" از نواب سرور الملک۔

(۲) احمد بخش خاں نے نصر اللہ بیگ کے سوار دستے کو تحلیل کر کے پچاس سواروں کی گرانٹ خورد بُرد کر لی ہے۔

(۳) نصر اللہ بیگ کے بھتیجے اور بھانجے کو اب تک صرف تین ہزار سالانہ وصول ہوئے ہیں باقی رقم خورد بُرد ہو گئی۔

(۴) احمد بخش خاں نے خواجہ حاجی کو جو نصر اللہ بیگ کا ملازم تھا اپنے کاموں پر پردہ ڈالنے کے لئے لارڈ لیک کے سامنے نصر اللہ بیگ کا رشتہ دار ظاہر کیا اور اُسے بھی شریک پرورش کر لیا۔

اس مقدمے سے متعلق ساری دستاویزوں میں یہی باتیں بار بار دہرائی گئی ہیں۔ انگریز حاکموں کا طریق کار ابتدا سے یہی تھا اور ہماری بیورو کریسی (افسر شاہی) بھی آج تک اُسی لکیر کی فقیر بنی ہوئی ہے کہ جو بھی قضیہ ہو اُسے ابتدائی درجے سے اُٹھایا جائے۔ بالائی محکموں کے افسر عموماً زیریں محکمے کی تفتیش اور رپورٹ کو برقرار رکھنے پر ہی اصرار کرتے ہیں۔ جب تک اُن کی تنقیحات میں کوئی نمایاں سقم اور بے قاعدگی نہ پائی جائے۔

ایک درخواست میں غالب نے یہ بھی لکھا کہ "معتمد اور ایجنٹ نے فدوی کے مقدمے کو "غت ربود" کیا ہے" یعنی اس میں گھپلا پیدا کر دیا ہے۔ سکریٹری اور ایجنٹ کی سطح کے حاکموں کے خلاف ایسی شکایت کو انگریز کب سُن سکتے تھے۔ افضل بیگ نے اپنے جواب دعوے میں لکھا تھا۔

"دشمنی اور کینہ پروری نے اسد اللہ خاں کے ذہن کو اس حد تک ماؤف کر دیا ہے کہ وہ حکومت کے اہلکاروں کو امور مملکت کے انتظام کی تعلیم دینے کا دعویٰ کرتا ہے اور پنشن کے حق داروں کی درجہ بندی کو آپ کے خدام کی غلطی بتاتا ہے۔"

غالب سے جب یہ کہا گیا کہ وہ پہلے دہلی میں ایجنٹ کے دفتر سے رجوع کریں تو وہاں نواب شمس الدین خاں کے "ہم پیالہ و ہم نوالہ" انگریز دوست

بیٹھے ہوئے تھے جو اُن کی رئیسانہ اور پُر تکلّف خاطر مدارات سے بہرہ ور ہوتے رہتے تھے۔ تحفے تحائف بھی خوب چلتے ہوں گے۔ غالب کتنے ہی بڑے شاعر سہی مگر ان حکام کے سامنے اور نواب شمس الدین احمد خاں کے مقابلے میں ایک عام شہری تھے، وہ ان حکام کو زیادہ سے زیادہ ایک قصیدہ لکھ کر خوش کر سکتے تھے۔ خود غالب نے سکریٹری حکومت کے نام اپنی درخواست (مورخہ ۲۸ جولائی ۱۸۳۰ء) کو لکھا تھا۔

"فیروز پور کے جاگیردار دولت مند ہیں اور میں غریب ہوں۔ یقیناً بہت غریب۔ دہلی ریزیڈنسی کے تمام اہلکار دل و جان سے فیروز پور والے کے ساتھ ہیں۔"

کرنل میلکم[۱] (MALCOM) نے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو جو خط نواب احمد بخش خاں کے نام لکھا تھا۔ اس میں ان کی خدمت گذاری، خیر اندیشی اور جاں فشانی کا اعتراف کیا ہے اور ان خدمات کے صلے میں فیروز پور جھرکا، پٹنہ، سانگرس، بتھانہ، نحبھورا اور نگینہ وغیرہ کی جاگیر کا پروانہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"آپ کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرحوم کے متوسلین خواجہ حاجی وغیرہ کی پرورش و پرداخت کریں گے۔"

اس پروانے کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ یہ احمد بخش نے نہایت چالاکی سے اپنی مرضی اور مفاد کے مطابق لکھوایا ہے۔ اس میں "متوسلین" (DEPENDANTS) کا لفظ ہے وارثین (INHERITORS) کا ذکر نہیں، نام صرف خواجہ حاجی کا لکھا ہے باقی سب ورثا "وغیرہ" کے تحت آتے ہیں۔

جارج سوئنٹن (George Swinton) چیف سکریٹری حکومت ہند نے اس بارے میں جو مراسلہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو چیف سکریٹری حکومت بمبئی

---

[۱] سر جان مالکم ولادت ۲ مئی ۱۷۶۹ء وفات ۳۰ جولائی ۱۸۳۳ء

کے نام بھیجا تھا۔ اُس میں لکھا تھا کہ فارسی خط پر انگریزی زبان میں کوئی دستخط نہیں، جیسا کہ دستور ہے کہ شعبہ فارسی کے معتمد کے دفتر سے فارسی زبان میں جاری کیے جانے والے خط کی پشت پر انگریزی میں دستخط ہوا کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے احمد بخش خاں نے اس آرڈر کو لکھوا کر اپنے قبضے میں رکھ لیا ہوگا۔ اسی مذکورہ بالا شقے میں یہ بھی درج ہے کہ

"آپ کو ان علاقوں میں حاکمانہ اختیار حاصل ہوگا' اس لیے وہاں کے باشندوں کی شکایات قابل سماعت قرار نہیں پائیں گی"۔

غالب احمد بخش خاں کی رعایا اور فیروز جھرکا کے باشندے نہ سہی، مگر اُن کے خزانے سے وظیفہ پاتے تھے، اور اس خاندان سے رشتہ داری رکھتے تھے، تو ایک طرح سے احمد بخش خاں کے زیردست اور محکوم ہی تھے۔ جب احمد بخش خاں، کو داخلی خود مختاری دے دی گئی تھی تو اُن کے خلاف عام نوعیت کی شکایتوں اور فریادوں کی سماعت بھی انگریز حکام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بظاہر اس دستاویز میں یہ فقرہ بھی پیش بندی کے طور پر لکھوا لیا گیا تھا۔

غالب کے دعوے میں دو کمزوریاں اور بھی تھیں۔

اوّل یہ کہ وہ ۷، جون ۱۸۰۶ء والی دستاویز کو "جعلی" بتاتے تھے جس پر لارڈ لیک کے دستخط بھی تھے اور مہر بھی ثبت تھی۔ جعل سازی کا یہ الزام احمد بخش خاں پر ہی نہیں لارڈ لیک پر بھی آتا تھا۔ انگریز نے اپنے اعلیٰ احکام کے خلاف ایک عام شہری کے بے ثبوت الزام پر کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی، یہی غنیمت ہے۔

غالب نے ولیم بنٹنک گورنر جنرل (WILLIAM BENTINCK) کے نام اپنی درخواست میں لکھا تھا۔

"اس سند پر لگی ہوئی مہر اور دستخط سب جعلی ہیں اور دوسرے یہ کہ مرحوم نواب احمد بخش خاں نے اپنی رہائش گاہ پر تیار کی اور لکھوائی

اور عملے کو رشوت دے کر اُس زمانے میں جب لارڈ لیک صاحب بہادر
دوسرے اہم امور و معاملات میں بہت اُلجھے ہوئے تھے اس دستاویز
کو فارسی زبان کی دوسری ڈھیروں دستاویزات اور کاغذات میں رکھ کر
جو روزانہ دستخط کے لیے اُن کے سامنے گزاری جاتی تھیں یہ درخواست
بھی پیش کروائی اس پر دستخط حاصل کر لیے اور یہ اپنی نوعیت کا
بدترین فریب اور انتہائی گھٹیا اور خطرناک جعل سازی تھی۔
(۲۶۔ستمبر ۱۸۳۰ء)

غالبؔ بیچارے نرے شاعر تھے انھوں نے یہ لکھ تو دیا مگر یہ نہ سوچا کہ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جائے گا یعنی لارڈ لیک کاغذوں پر بڑھے بغیر دستخط کر دیا کرتے تھے اور وہ اس "بدترین فریب اور انتہائی گھٹیا اور خطرناک جعل سازی میں ایک فریق بن گئے تھے۔

دوسری بات یہ کہ غالبؔ نے صراحت کے ساتھ تو نہیں مگر کنایتہً ایسے الفاظ بھی اپنی درخواستوں میں بار بار لکھے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی حکام کو احمد بخش خاں نے رشوت دے کر اپنے مفاد میں دستاویزیں تیار کرالی تھیں۔ بات تو صحیح ہے مگر اس کا ثبوت مہیا کرنا غالبؔ کے لیے ممکن نہیں تھا تو کنایتہً بھی نہیں لکھنا چاہیے تھا۔

الیف ہاکنس (F. HAWKINS) قائم مقام ریزیڈنٹ دہلی نے چیف سکریٹری سوئنٹن (SWINTON) کے نام اپنے مراسلے مورخہ ۸۔اکتوبر ۱۸۳۰ء میں لکھا تھا۔

"نواب صاحب (شمس الدین احمد خاں) نے مطلوبہ خط جو فارسی
میں لکھا ہوا ہے اور جس پر لارڈ لیک بہادر کی مہر اور دستخط ثبت ہیں، مجھے

لے (FRANCIS HAWKINS) دلی میں ریزیڈنٹ تھا، اس نے غالبؔ کے خلاف سخت رپوٹیں لکھی تھیں۔ غالبؔ کے فارسی خطوط میں اس کا ذکر ہوا ہے اور ایک فارسی قطعہ بھی کلیاتِ نظم غالبؔ میں ملتا ہے۔

ارسال کر دیا ہے اور اسے پیش کرتے ہوئے مجھے امید ہے کہ اسے دیکھنے کے بعد حکومت کو اس کے اصلی ہونے کا اس طرح یقین ہو جائے گا جس طرح مجھے گذشتہ مئی میں اُس وقت یقین ہو گیا تھا جب میں نے اسے دیکھا تھا اور میں نے اسداللہ خاں کے دعوے کے بارے میں رپورٹ دی تھی اور اس شخص کے جھوٹے دعوے کو تسلیم کرنے کی اذیت میں مبتلا نہیں ہو گی جس نے نہ صرف حکومت کو بلکہ آپ کو اور مجھے بہت پریشان کیا اور (نواب شمس الدین) کی دل شکنی کی۔ اب وہ شخص سزا سے نہیں بچ سکے گا۔"

نواب شمس الدین خاں کے زمانے میں بھی جارج سوئنٹن (G. SWINTON) چیف سکرٹری حکومت برطانیہ کے نام اپنے مراسلے میں پرنسیپ[1] (H.T. PRINCEP) نے ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو واضح لفظوں میں لکھا تھا۔

"حضور والا (گورنر جنرل) نصر اللہ خاں کے متوسلین کی مالی امداد کے ضمن میں فیروزپور کے جاگیردار کے کیے ہوئے انتظام و انصرام میں مداخلت پسند نہیں فرمائیں گے۔"

غالب کی نالش میں ایک شق یہ بھی تھی کہ احمد بخش خاں نے نصر اللہ بیگ کے پچاس سواروں کا دستہ موقوف کر دیا اور اس دستے کے لیے جو رقم مختص کی گئی تھی وہ خورد بُرد کرتے رہے۔ ان سواروں کی تنخواہ کی مد میں ۴ مئی ۱۸۰۶ء سے ۲۱ جولائی ۱۸۳۱ء تک ۳۵ ہزار روپے ہضم کر لیے گئے ہیں وہ ان سے واپس لے کر سرکاری خزانے میں جمع کرائے جائیں۔

یہ معاملہ حکومت اور احمد بخش خاں کے درمیان تھا۔ اس میں غالب کی فریاد

---

[1] (H.T. PRINSEP) ولادت ۱۵ جنوری ۱۷۹۲ء وفات ۱۱ فروری ۱۸۷۸ء شعبہ فارسی کے سکرٹری تھے متعدد کتابوں کے مصنف بھی۔

سے کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ نواب شمس الدین خاں سے جو وضاحت طلب کی گئی تھی اس میں انھوں نے اس الزام کی تردید وضاحت کے ساتھ نہیں کی صرف اپنے والد کی اور اپنی وفاداری اور فدویانہ خدمت گذاری کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ ان (انگریزوں) کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دوں" (۲۸ مئی ۱۸۳۰ء)

غالب اپنے وظیفے کی بقایا رقم (ARREARS) بھی ۴ مئی ۱۸۰۶ء سے واجب الادا سمجھتے تھے۔ انھیں یہ توقع تھی کہ اگر خواجہ حاجی کے حصّے کی پنشن ان کی طرف منتقل ہوگئی تو ۲۵ سال کے بقایا پچاس ہزار روپے ہوں گے۔ لیکن یہ صرف شیخ چلّی کے منصوبے تھے، سوچنے اور سوچ کر خوش ہو جانے والی بات تھی۔ بقایا کا ملنا اتنا آسان نہ تھا۔ حکومت برطانیہ جب سواروں کے دستے کی تن خواہ ہی واپس نہیں مانگ رہی تھی تو غالب کے بقایاجات کہاں سے دلواتی۔

غالب نے ۲۵۔ جولائی ۱۸۳۱ء کو اپنی درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ

"لارڈ لیک نے نصر اللہ بیگ کے اقربا کی پرورش و پرداخت کے لیے مبلغ دس ہزار روپے سالانہ کی رقم مختص فرمائی تھی، نیز مذکورہ سند (۷ جون ۱۸۰۶ء) سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مبلغ ۲۵ ہزار روپے کی جو رقم سرکار برطانیہ نے مختص فرمائی تھی وہ اضافی اور بالکل جداگانہ نوعیت کی ہے۔"

اس ضمن میں W. B. MARTIN نے ۲۴۔ اگست ۱۸۳۱ء کو سکریٹری گورنر جنرل کے نام مراسلے میں لکھا تھا۔

"مرحوم نصر اللہ خاں کے متوسلین کی کفالت کے ضمن میں احمد بخش خاں کو کسی مخصوص رقم کی ادائیگی کا پابند نہیں کیا گیا تھا۔ البتہ پرورش و پرداخت کی بابت اکثر و بیشتر اظہار خیال کیا جاتا رہا ہے چنانچہ اس ذمہ داری کے تعین کے لئے ۷۔ جون ۱۸۰۶ء کو ایک

اضافی سند تیار کی گئی تھی۔ اس کی رو سے سالانہ امدادی رقم ۵ ہزار روپے مقرر کی گئی تھی۔ یہی وہ دستاویز ہے جس کی بابت اسد اللہ خاں کا دعویٰ ہے کہ اس میں تحریف کی گئی ہے۔ لیکن جب اصل دستاویز سر جان میلکم بہادر کو تجزیے کے لئے پیش کی گئی تھی تو موصوف نے اُس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی تھی (۲۴ اگست ۱۸۳۱ء)

گورنر جنرل کے سکریٹری نے اپنے مراسلے مورخہ ۳۱ اگست ۱۸۳۱ء میں مندرجہ بالا رپورٹ کو "تسلی بخش" (SATISFACTORY) بتایا اور لکھا کہ مزید احکامات کی ضرورت نہیں۔

اپریل ۱۸۳۵ء تک نواب شمس الدین خاں کی جائداد (فیروز پور جھرکا وغیرہ) اُن کے تصرف میں رہی پھر وہ ولیم فریزر کے قتل (۲۲ مارچ ۱۸۳۴ء) کے الزام میں گرفتار ہوئے تو مئی ۱۸۳۵ء میں یہ جاگیر ضبط کر لی گئی اور ۹ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو نواب شمس الدین خاں پھانسی پر چڑھا دیے گئے۔

غالبؔ نے سوچا کہ جاگیر کی ضبطی کے بعد اب معاملہ براہِ راست حکومت برطانیہ سے متعلق ہے تو انھوں نے پھر سلسلہ جنبانی کی اور اپنے ۲۹ سال کے بقایاجات کا مطالبہ داغ دیا (۲۳ مارچ ۱۸۳۶ء) اور کہا کہ فیروز پور جھرکا کے خزانے سے دو لاکھ ساٹھ ہزار روپے جو حکومت برطانیہ کی تحویل میں آئے ہیں ان سے میرے مطالبات بے باق کر دیے جائیں۔ مگر اس درخواست پر لارڈ آکلینڈ (AUCKLAND) نے ۲۸ اپریل ۱۸۳۶ء کو یہ ریمارک لکھ کر مثل داخل دفتری کر دی کہ "کیا اس مقدمے کا بار بار فیصلہ نہیں ہوا ہے۔؟"

مرزا غالبؔ طویل عرصے تک کلکتے میں پڑے رہے۔ بار بار درخواستیں گذارتے تھے اُن پر رپورٹیں طلب ہوتی رہیں۔ کبھی کوئی رپورٹ اُن کے حق میں بھی ہو جاتی تھی، مگر آخری بار ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو حکومت نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ ایجنٹ صاحب بہادر کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ "وہ مدعی کو اس حقیقت سے مطلع فرمادیں کہ اس کا مقدمہ

نمٹایا جا چکا ہے۔"
اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ غالب دہلی کو واپس چلے جائیں۔ خود ان کے لفظوں میں "کھچڑی کھائی دن بہلائے۔ کپڑے پھاٹے گھر کو آئے۔"
۱۸۳۱ء میں وہ اپنا سا منھ لے کر واپس آ گئے۔ پھر بھی کچھ عرصے تک چھیڑ خانی کرتے رہے۔ لفٹننٹ گورنر آگرہ کو عرضیاں لکھ کر اس مقدمے کو زندہ رکھنا چاہا۔ وہاں سے یہ جواب مل گیا کہ جو مقدمہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی عدالت سے طے ہو چکا ہے۔ اُس میں ہم کچھ شنوائی نہیں کر سکتے
گورنر جنرل نے ۲۷ فروری ۱۸۳۹ء کو مرزا غالب کا مطالبہ حتمی طور پر نامنظور کر دیا۔
جس زمانے میں یہ مقدمہ کلکتے میں زیر سماعت تھا مرزا غالب نے دو سال تک اپنی پنشن بھی وصول نہیں کی تھی۔ اب ایک نیا قضیہ یہ اٹھ کھڑا ہوا کہ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم نے کمشنر کی عدالت میں بقایا جات کی وصولی کے لیے استغاثہ دائر کیا۔ انھیں یہ مشورہ دیا گیا کہ ان کی نالش اپنے شوہر کے خلاف ہونی چاہیے نواب شمس الدین خاں کی ریاست کے خلاف نہیں۔ (۷ اکتوبر ۱۸۳۷ء)
پھر ۲۰ فروری ۱۸۳۸ء کو الٰہی بخش معروف کے وارثوں (امراؤ بیگم بنیادی بیگم اور علی بخش خاں) نے گورنر جنرل کو درخواست دی کہ احمد بخش خاں ہمیں مقررہ سالانہ وظیفے کے علاوہ بھی مالی امداد دیا کرتے تھے جو ریاست کے ضبط ہونے کے ساتھ بند ہو گئی اور "ہم غربت کے پست ترین درجے تک پہنچ گئے ہیں۔"
نواب احمد بخش خاں کے بھائی الٰہی بخش معروف کی دو بیٹیوں بنیادی بیگم (زوجہ غلام حسین مسرور) اور امراؤ بیگم (زوجہ اسد اللہ خاں غالب) کی طرف سے ۱۲ اگست ۱۸۳۳ء کو ایک درخواست R.N.C. HAMILTON قائم مقام سکریٹری برائے لفٹننٹ گورنر کے دفتر میں بھی دی گئی تھی کہ ان کے (امراؤ بیگم کے) شوہر کی پنشن کے بقایا جات سے انھیں بھی رقم ادا کرنے کا بندوبست کیا جائے۔

فریزر صاحب نے مرزا اسد اللہ خاں کو بلا کر دریافت کیا کہ وہ اپنی پنشن کا کتنا حصہ اپنی اہلیہ کو دینا چاہیں گے؟

مرزا اسد اللہ خاں نے جواب دیا کہ ماضی میں انھوں نے اپنی اہلیہ کو سالانہ ۲۰۰ روپے بطور گذارا الاؤنس دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن گذشتہ پانچ سال سے انھوں نے اپنی بیوی کو کچھ بھی نہیں دیا ہے اس لیے کہ ان کی اہلیہ نے تین ہزار روپے میں اپنے زیورات فروخت کر کے گذارا کیا تھا اور اسی مجبوری کے تحت وہ قانونی چارہ جوئی پر مجبور ہوئی تھیں۔

ایجنٹ فریزر (FRAZER) نے ۲۴ اگست ۱۸۳۳ء کو نواب موصوف (شمس الدین خاں) کو ہدایت دی کہ وہ امراؤ بیگم کو اُن کے شوہر کے بقایاجات میں سے مبلغ تین ہزار روپے ادا کریں اور انھیں باقاعدگی سے ان کی پنشن کا تسلیم شدہ حصہ مبلغ چار سو روپے سالانہ ادا کرتے رہیں۔

غالب نے ایک چالاکی یہ بھی کی کہ وہ پنشن کے ۱۵ سو روپے سالانہ کو اپنا حصہ بتاتے تھے اور یہ کہتے رہے کہ میرے چھوٹے بھائی مرزا یوسف بیگ کو نظر انداز کر دیا گیا جو معذور بھی ہے بیمار بھی۔ حالانکہ احمد بخش خاں یہ رقم دونوں بھائیوں کے لیے دیتے تھے۔ جس طرح پندرہ سو روپیہ سالانہ نصر اللہ بیگ کی والدہ اور دو بہنوں کو ملتا تھا۔ غالب نے اپنے عرضی دعوے میں لکھا تھا کہ میں چھ سو روپے اپنے بھائی کے علاج اور دیکھ بھال کے لیے ادا کرتا ہوں۔ اگر بھائی کا حصہ یعنی ساڑھے سات سو روپے سالانہ تھا تو غالب انھیں ڈیڑھ سو روپے کم کیوں دیتے تھے؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھاوج اور ان کی بچّوں کی دیکھ ریکھ پر بھی زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اسی لیے یہ سب دلی چھوڑ کر جے پور کو سدھار گئے تھے۔

غرض پنشن کے مقدمے میں سولہ سترہ برس تک الجھے رہنے کے باوجود غالب کو قرض کی گراں باری کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ پنشن وہی ساڑھے سات سو روپے

سال یعنی باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینا رہی جس کا روزانہ کا اوسط دو روپے دو آنے ہوتا ہے۔ کچھ امداد ریاست رامپور سے ملتی رہی تھوڑی سی مدت کے لیے قلعہ شاہی سے تاریخ نویسی کی خدمت کے عوض پچاس روپے ماہانہ مقرر ہوئے تھے۔ جو چھ ماہ میں بھی مشکل سے ملتے تھے۔ غالب ساری زندگی معاشی اعتبار سے پراگندہ اور تنگدست ہی رہے۔

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو اُن کا انتقال ہوگیا۔ وہ آٹھ سو روپے کا قرض چھوڑ کر مرے تھے۔ بیوی کا زیور تو پہلے ہی سب ٹھکانے لگ چکا تھا۔ امراؤ بیگم نے جون ۱۸۶۹ء میں غالب کی پنشن کو اپنے اور حسین علی خاں شاداں (فرزند زین العابدین عارف) کے نام پر منتقل کرانے کے لیے کمشنری میں درخواست دی۔ اس پر یہ حکم ہوا کہ حسین علی خاں اُن کا بیٹا نہیں لے پالک ہے اور لے پالک کے نام پنشن منتقل نہیں ہوسکتی۔ سائلہ (امراؤ بیگم) دفتر میں پیش ہو تو اُسے دس روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جاسکتا ہے۔ امراؤ بیگم کی ضعیفی کے علاوہ یہ بھی مانع تھا کہ شریف خاندانوں کی بہو بیٹیاں کچہری میں جانا سخت معیوب اور باعث ننگ سمجھتی تھیں۔ امراؤ بیگم نے اتنے سے وظیفے کے لئے کچہری میں جانا گوارا نہ کیا اور غالب کی پہلی برسی کے دن (۴ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ / ۴ فروری ۱۸۷۰ء) کو وہ بھی قید حیات و بند غم سے نجات پاگئیں۔

○ ○ ○

مرزا غالب کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ یہی پنشن کا مقدمہ ہے جس کے بے واسطہ اور بلا واسطہ اثرات اُن کی زندگی پر نظر آتے ہیں۔ اسی کا ایک ضمنی واقعہ کلکتے کا وہ معرکہ ہے جو شاید مرزا افضل بیگ وغیرہ نے ان کی ہوا اکھاڑنے کے لئے کیا تھا، جس میں غالب کو معافی مانگنے کے لیے مثنوی آشتی نامہ لکھنی پڑی جو بعد کو مثنوی باد مخالف کے نام سے بھی شائع ہوئی اور اسی کے زیر اثر وہ ساری عمر

اپنی فارسی دانی کے اظہار پر زور دیتے رہے اور ہندوستانی فارسی دانوں کی توہین و تضحیک کرتے رہے۔

اس مقدمے نے انھیں حد سے زیادہ مقروض بھی کر دیا۔ جب وہ کلکتے میں رہے تو ان کی بیوی کو کچھ مدد لوہارو سے مل جاتی ہوگی ورنہ وہ اپنے زیور اور دوسرا گھریلو قیمتی سامان بیچ کر گذر بسر کرتی رہیں۔ غالب کو پنشن جو بھی ملتی تھی یا تھوڑی بہت آمدنی کسی دوسرے ذریعے سے ہوتی تھی اس کا قابل لحاظ حصہ سود میں چلا جاتا تھا، وہ اپنی بیوی کو پورا خرچ نہ دے پاتے تھے اسی لیے میاں بیوی میں مقدمے بازی کی نوبت بھی آگئی تھی۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ وہ رئیس زادے ہیں اور امتیازی حیثیت رکھتے ہیں مگر اُن کے جو معاشی وسائل تھے اُن کے ساتھ رئیسانہ زندگی گذارنا ممکن نہیں تھا۔

مقدمہ پنشن کے گہرے دور رس اور تہ نشیں اثرات غالب کی شخصیت، افتادِ طبع اور سیرت پر ہی نہیں اُن کے فکر و نظر اور شاعری پر بھی صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔ اُن کے دیوان میں اس طرح کے اشعار تلاش کیجیے اور اُن کے بین السطور میں مقدمہ پنشن کی روداد پڑھیے۔ میں یہاں بہ طور نمونہ صرف چند شعر لکھتا ہوں۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں (احمد بخش خاں کا رویّہ)

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟ (۷ جون ۱۸۰۶ء کا شقہ)

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے (سترہ سال تک بے سود تگ و دو)

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی (مقدمہ میں انگریزوں کی سرد مہری)

کیا بات ہے اُس انجمن ناز کی غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے (کلکتہ میں گورنر جنرل تک رسائی)

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں (قرض لے کر مقدمہ بازی)

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن (قرض خواہوں کا دباؤ)

یہ چند اشعار صرف بطور اشارہ لکھے گئے ہیں اس پس منظر میں غالب کے خطوط اور اشعار کا مطالعہ نہایت دلچسپ اور اثر انگیز نتائج پیدا کرے گا۔

مرزا نصر اللہ بیگ نواب احمد بخش خاں کے بہنوئی بھی تھے، انھوں نے کوئی صلبی اولاد نہیں چھوڑی تھی، اُن کے بھائی مرزا عبداللہ بیگ کی اولاد ہی اُن کی حقیقی وارث تھی۔ احمد بخش خاں نے یقیناً یہ زیادتی اور ناانصافی کی تھی کہ مرزا حاجی کو اُن کے وارثوں میں شامل کر لیا تھا۔ اگر شریعت کے قانون وراثت کی رو سے غالب نے یہ مقدمہ لڑا ہوتا تو شاید انھیں کامیابی ہو جاتی۔ اب نہ فیروز جھرکا کی ریاست رہی، نہ احمد بخش خاں رہے نہ نواب شمس الدین خاں

رہے۔ غالب اپنی زندگی شاد و ناشاد گذار کر چلا گیا مگر اُس کے طفیل میں ہم آج احمد بخش خاں کو بھی یاد کر رہے ہیں۔ فیروز پور جھرکا بھی معرض بحث میں آ رہا ہے۔ انگریزی عملے کے لوگوں کی چھان بین بھی کی جا رہی ہے ورنہ

دارا رہا نہ جم نہ سکندر سا بادشاہ
تخت زمیں پہ سیکڑوں آئے چلے گئے

احمد بخش خاں نے غالب کی زندگی اجیرن کر دی تھی مگر غالب نے احمد بخش خاں کو اُن کے مرنے کے بعد بھی زندہ رکھا ہے۔

مخمور سعیدی

مرزا غالبؔ کی پنشن کا قضیہ اور دیگر امور

نواب شمس الدین احمد خاں کے حوالے سے

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ مرزا غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں الور کے راجہ بختاور سنگھ کی طرفداری میں لڑتے ہوئے گولی کا نشانہ بنے تھے۔ اس جاں نثاری کے صلے میں راجہ بختاور سنگھ نے ان کے دونوں بیٹوں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اور مرزا یوسف بیگ خاں کی پرورش کے لیے دو گاؤں کی آمدنی اور کچھ روزینہ مقرر کر دیا تھا جو ایک مدت تک جاری رہا۔[1]

والد کی وفات کے وقت مرزا غالبؔ کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ والد کی وفات کے بعد ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ خاں نے ان کی سرپرستی کی۔ غالبؔ نے ایک جگہ اپنے خود نوشت حالات لکھتے ہوئے مرزا نصراللہ بیگ خاں کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔

"..... حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کا صوبہ دار تھا۔ ۱۸۰۳ء میں جب جرنیل لیک صاحب اکبرآباد آئے تو نصراللہ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا برگیڈیر بنا دیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اس نے اپنے زورِ بازو سے سونک سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لیے جرنیل صاحب نے وہ دونوں

(۱) یادگار غالبؔ، اشاعت اوّل، ص۱۱

پرگنے بہادر موصوف کو بطریق استمرار عطا کیے۔ مگر خان موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے بعد بہ مرگ ناگہاں ہاتھی پر سے گر کر مرگیا۔ جاگیر سرکار میں بازیافت ہوئی اور اس کے عوض نقد مقرر ہوئی[1]

یہ ۱۸۰۶ء کا واقعہ ہے۔ نصر اللہ بیگ خاں کی جاگیر کے عوض سرکار انگریزی نے اُن کے لواحقین کی پنشن مقرر کی۔ مرزا غالب اور ان کے چھوٹے بھائی کے حصے میں ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ آئے جس میں سے سات سو پچاس روپے غالبؔ کو ملتے تھے۔ مولانا حالی نے والی الور راجہ بختاور سنگھ کی طرف سے مرزا غالب اور ان کے چھوٹے بھائی مرزا یوسف کی پرورش کے لیے جس وظیفے کے جاری کیے جانے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ مدت دراز تک جاری رہا، وہ کب بند ہوا اور کن وجوہ سے بند ہوا، اس بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ "پنج آہنگ" میں غالب کا ایک خط[2] مرزا اسفند یار بیگ کے نام ملتا ہے۔ جو انھوں نے ۱۸۵۰ء میں ان کی دیوانی الور کے زمانے میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے "گوشہ و توشہ" کی بحالی کی درخواست کی ہے۔ لیکن یہ درخواست نامسموع رہی اور غدر کے زمانے تک ان کا گذارہ انھی سات سو پچاس روپے سالانہ پر رہا جو نصر اللہ بیگ خاں کے وارث کی حیثیت سے سرکار انگریزی سے ان کے لیے مقرر ہوا تھا۔

غالبؔ کے مربی اور حقیقی چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی شادی نواب احمد بخش خاں والی لوہارو کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ مگر وہ اولاد ہونے سے پہلے ہی وفات پاگئی تھیں اسی لیے نصر اللہ بیگ خاں نے اپنے مرحوم بڑے بھائی مرزا عبد اللہ بیگ خاں کی

---

[1] رسالہ اُردو، جولائی ۱۹۲۸ء، خود نوشت حالات کا عکس

[2] کلیات نثر غالب ص ۲۲ ۔ یہ وہی اسفند یار بیگ معلوم ہوتے ہیں جنھیں شمس الدین احمد خاں نے اپنی عذر داری کے لیے گورنر جنرل کے پاس کلکتے بھیجا تھا۔ نواب صاحب کے خلاف غالب کی معاندانہ روش سے وہ واقف تھے۔ اسلیے انھوں نے غالب کی درخواست کو نظر انداز کردیا

اولاد کو اپنی اولاد کی طرح جانا اور وہی ان کی وارث قرار پائی۔ نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم کے ساتھ مرزا غالب کی شادی کو بھی اس پس منظر میں دیکھا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا۔

نواب احمد بخش خاں کا انگریز حکام میں اچھا رسوخ تھا۔ انھوں نے کتنے ہی معرکوں میں لارڈ لیک کا سرگرم ساتھ دیا تھا اور لارڈ لیک انھیں بہت مانتے تھے۔ فتح آگرہ کے بعد لارڈ لیک نے مرزا نصر اللہ بیگ خاں کو جو اعزاز و اکرام دیا، وہ نواب احمد بخش خاں ہی کی سفارش کا ثمرہ تھا اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں کو بلا مزاحمت شہر انگریز فوجوں کے حوالے کر دینے کا مشورہ نواب احمد بخش ہی نے دیا ہو۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا نصر اللہ بیگ خاں اُن کے حقیقی بہنوئی تھے۔

نواب احمد بخش خاں کو اپنی گوناگوں خدمات کے صلے میں سرکار انگریزی کی طرف سے فیروز پور جھرکہ اور مضافات ہوڈل میں نگینہ اور پوہانہ وغیرہ کی جاگیر بہ طور استمرار عطا ہوئی تھی اور چونکہ وہ ریاست الور کے وکیل تھے اس لیے مہاراجہ بختاور سنگھ والیِ الور نے اپنی طرف سے انھیں لوہارو کا پرگنہ دے دیا تھا جو اس سے پہلے الور ہی کا ایک حصہ تھا۔ فیروز پور جھرکہ کی استمراری جاگیر سے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کے لیے نواب احمد بخش خاں سرکار انگریزی کو ۲۵ ہزار روپے سالانہ ادا کیا کریں گے۔

مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر ان کی جاگیر کی واپس لے لینے کے ساتھ ساتھ سرکار انگریزی نے چار سو سواروں کا وہ رسالہ بھی توڑ دیا جو ان کی تحویل میں دیا گیا تھا البتہ ان میں سے پچاس سواروں کا ایک دستہ نواب احمد بخش خاں کو دے دیا گیا کہ وہ اسے برقرار رکھیں سرکار کو جب ضرورت ہوگی، طلب کر لے گی۔ اس دستے کے اخراجات نیز مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کی پنشن کے لیے ۴ مئی ۱۸۰۶ء کو حکم جاری کیا گیا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر سے

جو ۲۵ ہزار روپے سالانہ سرکار انگریزی کو دیتے تھے وہ اس شرط پر معاف کیے جاتے ہیں کہ آئندہ وہ ۱۵ ہزار سالانہ اس دستے کی غور و پرداخت پر خرچ کریں اور باقی دس ہزار روپیہ نصر اللہ بیگ خاں کے ورثا کو بہ طور پنشن دیں۔

مالک رام لکھتے ہیں کہ اس فیصلے کے ایک ہی مہینے بعد، ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے کسی طرح ایک اور شقہ حاصل کر لیا جس میں یہ درج تھا کہ مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین کو پانچ ہزار روپے سالانہ بہ تفصیل ذیل ادا کیا جائے۔

(۱) خواجہ حاجی۔ دو ہزار روپے سالانہ

(۲) مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں۔ ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ

(۳) مرزا نوشہ اور مرزا یوسف، برادر زادگان مرزا نصر اللہ بیگ خاں مرحوم۔ ڈیڑھ ہزار روپے سالانہ

خواجہ حاجی مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے متعلقین میں نہیں تھا لیکن اُن کے متوسلین میں ضرور تھا کیونکہ یہ چار سو سواروں کے اس دستے کا افسر رہا تھا جو انھیں دیا گیا تھا اور اب ان پچاس سواروں کا افسر تھا جو اُن چار سو کا بقیہ تھے اور نواب احمد بخش کی تحویل میں دیے گئے تھے۔

جب وظیفے کی یہ تقسیم عمل میں آئی تو مرزا غالب کم سن تھے، اس پر انھوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ جو رقم اُن کے حصے میں آئی تھی وہ اس وقت ان کے مصارف کے لیے کافی بھی تھی لیکن جب انھوں نے ہوش سنبھالا اور اُن کے مصارف میں اضافہ ہوتا گیا تو انھوں نے محسوس کیا کہ اُن کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہیں سے اس قضیے کا آغاز ہوا جس میں وہ کم و بیش سولہ سترہ سال تک اُلجھے رہے۔

جیسا کہ غلام رسول مہر نے لکھا ہے غالب کی پنشن کا جھگڑا نواب احمد بخش خاں کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔[1] لیکن ان کی وفات کے بعد اس میں شدت پیدا

---

(۱) غالب ص ۴۴، طبع چہارم، لاہور

ہوگئی۔ نواب احمد بخش خاں جب تک زندہ رہے پنشن کے علاوہ بھی وہ ان کے ساتھ اس لیے کچھ سلوک کرتے رہتے تھے کہ وہ اُن کے بھتیجے داماد بھی تھے اور ان کے مرحوم بہنوئی کے بھتیجے بھی۔ ۱۸۲۲ء میں انھوں نے انگریزی سرکار اور الور دربار کی منظوری سے اپنی جائداد کی تقسیم اس طرح کی کہ اُن کے بعد فیروز پور جھرکہ ان کے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں کو ملے جو اُن کی میواتی حرم مدّی عرف بہو خانم کے بطن سے تھے اور لوہارو کی جاگیر ان کے دونوں چھوٹے بیٹوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں میں تقسیم کر دی جائے جو اُن کی بیاہتا بیوی بیگم جان کی اولاد تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں چونکہ ایک غیر خاندانی عورت کے بطن سے تھے۔ اس لیے خاندان کے دیگر افراد انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ اور وہ خود بھی اپنے بھائیوں سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ نواب احمد بخش خاں نے مستقبل کے مناقشات کے اندیشے سے جیتے جی ہی ریاست کے انتظام سے کنارہ کشی اختیار کی شمس الدین احمد خاں کو فیروز پور جھرکہ کا نواب تسلیم کر لیا گیا اور لوہارو دوسرے دونوں بیٹوں کو مل گیا۔ (۱)

اس نئے انتظام کے نتیجے میں غالب کی پنشن نواب شمس الدین احمد خاں سے متعلق ہوگئی۔ غالب قدرتی طور پر امین الدین احمد خاں کے طرفداروں میں تھے کیونکہ وہ احمد بخش خاں کی خاندانی بیگم کے بطن سے تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں نے اوّل تو پنشن کی ادائیگی میں بے قاعدگی کو راہ دی۔ لیکن اپریل ۱۸۳۱ء میں بالکل ہی موقوف کر دی اور یہ نواب شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری ۱۸۳۵ء تک بند رہی۔ نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دیئے جانے کے بعد ہی غالب کی پنشن دوبارہ جاری ہو سکی اور انھیں چار سال کا بقایا بھی یک مشت ملا (۱۸۳۶ء) غالب کو ایک اور واقعے نے بھی مشتعل کیا۔ غالب خواجہ حاجی کو اس کا

---

(۱) ذکر غالب، صد ۲۷، دوسرا ایڈیشن

مستحق نہیں گردانتے تھے کہ وہ اُن کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے حوالے سے پنشن پائے لیکن ۱۸۲۶ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کے حصے کے دو ہزار روپے سالانہ اس کے دونوں بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدرالدین خاں عرف خواجہ امان کے نام منتقل کر دیے گئے تو ان کا پارہ اور چڑھ گیا۔ شاید انھیں توقع تھی کہ خواجہ حاجی کے مرنے کے بعد یہ رقم خود اُن کے اور ان کے بھائی کے نام ہو جائے گی۔ ایسا نہ ہونے پر انھوں نے ناراضگی کا اظہار کیا اور شکایت بھی درج کرائی جو بے اثر رہی۔

ان بدلے ہوئے حالات میں آخر کار غالب نے پنشن کی رقم میں اضافے کے لیے قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے انھیں کلکتے کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ غالب اگست ۱۸۲۶ء میں دہلی سے روانہ ہوئے اور کانپور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے جہاں ان کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اور وہ ایک سال تک وہاں رکے رہے[1]۔ یہ مشہور غزل جس کے چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں، انھی دنوں کی یادگار ہے۔

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ‖ ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو
مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر ‖ عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو
لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب ‖ جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

ایک سال کے قیام لکھنؤ کے بعد غالب کانپور، بنارس، پٹنہ، مرشد آباد ہوتے ہوئے اور اس زمانے کے مشکل سفر کی سختیاں اٹھاتے ہوئے ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتہ پہنچے اور اسی دن انھیں شملہ بازار میں گورو کے تالاب کے نزدیک مرزا علی سوداگر کی حویلی میں سکونت کے لیے ایک کشادہ مکان مل گیا۔ جس میں ضرورت کا تمام سامان موجود تھا اور کرایہ دس روپے ماہانہ تھا[2]۔

---

(۱) یادگارِ غالب، ص ۲۵
(۲) کلیاتِ نثرِ غالب، ص ۱۵۹، خط بنام رائے چھج مل

غالب نے گورنر جنرل کی کونسل میں اپنا مقدمہ پیش کیا تو وہاں سے جواب ملا کہ یہ مقدمہ پہلے دہلی میں انگریز ریذیڈنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہیئے۔ اس کی رپورٹ پر یہاں مناسب کارروائی کی جائے گی۔ یہ جواب ملنے پر وہ خود تو کلکتے سے دہلی نہیں آئے کہ یہ دشوار بھی تھا اور دیر طلب بھی، انھوں نے دہلی میں مقدمے کی پیروی کے لیے ہیرالال کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔ انھوں نے کلکتے سے دہلی کے ریذیڈنٹ وسر ایڈورڈ کولبروک اور ان کے میر منشی التفات حسین خاں کے لیے دو سفارشی خطوط بھی اپنے وکیل ہیرالال کو بھیجے۔ غالب کے وکیل کی پیروی اور ان سفارشوں کا مثبت نتیجہ نکلا۔ اور ریذیڈنٹ نے ان کے حق میں رپورٹ بھجوادی غالب کی شومی تقدیر کہ جلد ہی ریذیڈنٹ کولبروک کو بہ جرم رشوت ستانی معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ فرانسس ہاکنس ریذیڈنٹ مقرر ہوا۔ غالب کی طرف سے مقدمہ دائر ہونے سے پہلے ہی چونکہ نواب احمد بخش خاں انتقال کر چکے تھے (۱۸۲۶ء) اس لیے اب مدعا علیہ نواب شمس الدین احمد خاں تھے جن کے ہاکنس کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے۔ ان کے کہنے پر ہاکنس نے دوسری رپورٹ کلکتے بھیجی جس میں لکھا کہ غالب کو جو ساڑھے سات سو روپے سالانہ اب تک ملتے رہے ہیں، وہ اس سے زیادہ کے مستحق نہیں۔[1]

کلکتے میں ایک لمبے قیام اور ہاکنس کے مخالفانہ رویّے کی خبر سن کر غالب نے دہلی لوٹ جانے کا ارادہ کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ دہلی پہنچ کر وہ اپنے اثر و رسوخ سے موافقانہ رپورٹ تیار کرا سکیں گے۔ کلکتے میں مقدمے کی دیکھ بھال کے لیے انھوں نے منشی نصر اللہ خاں کو اپنا وکیل مقرر کیا اور خود دہلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ دہلی سے تین برس کی غیر حاضری کے بعد وہ ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء کو واپس یہاں پہنچے۔

---

(۱) کلیاتِ نظم فارسی میں غالب کے دو ہجویہ قطعے ہاکنس کے تعلق سے درج ہیں (قطعہ ۵، ۶)

غالب کا مقدمہ پانچ امور پر مشتمل تھا جو یہ تھے۔

۱۔ ۴ مئی ۱۸۰۶ء کے حکم کے مطابق مجھے اور میرے خاندان کے دیگر افراد کو دس ہزار روپے سالانہ ملنا چاہیئے تھا۔ نواب لوہارو پانچ ہزار دیتے ہیں اور اس میں سے بھی دو ہزار ایک غیر شخص خواجہ حاجی (یا اس کے ورثا) کو ملتے ہیں۔ آئندہ پورے دس ہزار کی ادائگی کا حکم صادر کیا جائے۔

۲۔ مئی ۱۸۰۶ء سے اب تک ہمیں دس ہزار سالانہ سے جتنا کم ملا ہے، وہ سارا بقایا دلایا جائے۔ ان کے حساب سے یہ رقم ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ بنتی تھی۔

۳۔ ہماری پنشن میں کسی غیر شخص کو حصّہ دار نہیں ہونا چاہیئے۔ اشارہ خواجہ حاجی کے بیٹوں کی طرف تھا۔

۴۔ آئندہ پنشن کی ادائگی رئیس میوات شمس الدین احمد خاں کے ذمے نہ رکھی جائے، انگریزی خزانے سے ادا کی جائے تاکہ میں اس کا دست نگر نہ رہوں۔

۵۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ان امور کا فیصلہ میرے حق میں کیا جائے۔ نیز بہ طور اعزاز و اکرام مجھے خطاب و خلعت و دربار کا منصب دیا جائے۔

یہ غالب کے مطالبات کا خلاصہ ہے۔ ۴ کے تحت انھوں نے یہ خواہش بھی کی تھی کہ چونکہ نصر اللہ بیگ خاں لاولد فوت ہوئے اور میں ان کا سب سے بڑا بھتیجا، مانند بیٹے کے ہوں، مجھے ان کا جانشین قرار دیا جائے اور مرحوم کے تمام لواحقین کو دی جانے والی رقم مجھے دے دی جائے اور ان کی پرورش میرے ذمے کر دی جائے[1]۔

نواب شمس الدین احمد خاں نے جواب دعویٰ میں ۷ جون ۱۸۰۶ء کا ایک فارسی شقہ پیش کیا جس کی رو سے دس ہزار کی بجائے پانچ ہزار کی تقسیم عمل میں آئی تھی۔ غالب اس شقے سے لاعلم تھے۔ انھوں نے اسے جعلی ٹھہرایا اور دلیل یہ دی کہ اس

---

(۱) غالب کی پنشن کا مقدمہ، مرتبہ گوہر نوشاہی، شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان، پاکستان

کی نقل دہلی سے کلکتے تک کسی سرکاری دفتر میں موجود نہیں اور اس کی پشت پر انگریزی میں دستخط بھی نہیں جبکہ سرکاری قاعدے کی رو سے ان تمام خطوط کی پشت پر، جو فارسی میں لکھے جائیں، انگریزی میں دستخط ضروری ہیں۔ لہٰذا عملدرآمد اسی ۱۸۰۶ء والے حکم پر ہونا چاہیئے جو لارڈ لیک کے دستخطوں سے جاری ہوا تھا۔ نواب احمد بخش خاں نے جب دوسرا رقعہ لارڈ لیک سے حاصل کیا، ان دنوں سر جان ملکم ان کے سکریٹری تھے۔ ۲۲ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو یہ شقّہ حکومتِ بمبئی کے چیف سکریٹری کو تمام کوائف مقدمہ کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہ سر جان ملکم سے، جو اب بمبئی کے گورنر تھے، دریافت کر کے لکھیں کہ سچائی کیا ہے۔ سر جان ملکم نے کہا کہ واقعی یہ شقّہ احمد بخش خاں کو دیا گیا تھا۔ خط کی پشت پر انگریزی میں دستخطوں کا نہ ہونا چنداں اہم نہیں۔ اس پر ۲۷ جنوری ۱۸۳۱ء کو غالبؔ کو جواب دیا گیا کہ گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل موجودہ انتظام میں ردوبدل کو تیار نہیں۔ اس واضح جواب کے بعد بھی غالبؔ اپنے مطالبے پر قائم رہے۔

غالبؔ کی پنشن کا قضیہ چل ہی رہا تھا کہ نواب شمس الدین احمد خاں پر ایک آفت ٹوٹی۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی رات کو دہلی کے انگریز ریذیڈنٹ ولیم فریزر کو کسی نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ قاتل اس وقت تو بچ نکلا لیکن ابتدائی تفتیش کے بعد پولیس نے نواب کے داروغہ شکار کریم خاں کو گرفتار کر لیا۔ کچھ دن بعد نواب کا ایک اور ملازم واصل خاں بھی مشتبہ حالات میں گرفتار ہوا۔ کچھ ایسے اشارے ملے جن سے شبہ گذرا کہ اس قتل میں خود نواب شمس الدین احمد خاں بھی ملوّث ہیں۔ کریم خاں کا ساتھی انیا میو بھی، جو یہ بھنک پا کر کہ نواب کے بعض مقربین اس پر بھروسا نہ کرتے ہوئے، اس کی طرف سے افشائے راز کے اندیشے کے پیشِ نظر اسے بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں، فرار ہو گیا تھا، پکڑا گیا اور سرکاری گواہ بن گیا۔[1]

---

(۱) غالبؔ از غلام رسول مہرؔ، مطبوعہ لاہور

انیا میو کے بیان نے اس خیال کو اور تقویت دی کہ اس قتل کے ذمہ دار نواب شمس الدین احمد خاں ہیں۔ تحقیقات کنندہ مجسٹریٹ نے نواب صاحب کو لکھا کہ تحقیقات کو مکمل کرنے کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس لیے آپ کچھ دن کے لیے دہلی تشریف لے آئیں تو بہتر ہو۔ یہ خط ملنے پر نواب صاحب کے خیر خواہوں نے اور ان کے افراد خاندان نے بھی انھیں مشورہ دیا کہ وہ دہلی کے بجائے پنجاب، سکھ علاقے میں چلے جائیں تو مناسب ہوگا۔ لیکن نواب کو یا تو اپنی حیثیت کا بھرم تھا، یا یہ یقین تھا کہ وہ خود کو بے گناہ ثابت کر دیں گے، انھوں نے اس مشورے پر کان نہیں دھرے اور ۱۸ اپریل ۱۹۳۵ء کو دہلی پہنچ گئے۔ دہلی پہنچتے ہی انھیں حراست میں لے لیا گیا۔ ان کے علاوہ ان کے بہت سے متعلقین، بالخصوص ان کے خسر مرزا مغل بیگ خاں پر بہت سختی کی گئی۔ ان کی خانہ تلاشی ہوئی اور کچھ دن انھیں بھی نظر بند رہنا پڑا۔ (۱)

نواب شمس الدین احمد خاں اور ولیم فریزر کے درمیان کشیدگی پہلے سے تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ولیم فریزر رنگین مزاج شخص تھا اور ہندوستانی عورتوں کی طرف خصوصی رغبت رکھتا تھا (۲) اس نے کسی موقعے پر نواب کی بہن جہانگیرہ کی خوبصورتی کی تعریف کی جو نواب کی خفگی کا سبب بنی۔ اس کشیدگی کی ایک بڑی وجہ لوہارو کی جائداد کا جھگڑا بھی تھا۔ نواب احمد بخش خاں کی وصیت کی رو سے فیروز پور جھرکا کا علاقہ شمس الدین احمد خاں کو اور لوہارو ان کے دونوں سوتیلے بھائیوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد شمس الدین احمد خاں نے اس تقسیم کو غیر درست قرار دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے پوری ریاست کا والی

---

(۱) غالب از غلام رسول مہر مطبوعہ لاہور

(۲) "بزم داغ" کا ایک بیان بحوالہ نواب مرزا خاں داغ دہلوی ابن نواب شمس الدین احمد خاں صہ ۲۱۵

مجھے بننا چاہئے۔ دوسری اولاد کو وظیفہ دلایا جاسکتا ہے۔ ستمبر ۱۸۳۳ء میں وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ اور لوہارو کبھی اس شرط کے ساتھ ان کے حوالے کر دیا گیا کہ وہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے گزارے کے لیے چھبیس ہزار روپے سالانہ دیتے رہیں گے۔ ولیم فریزر نے اس کوشش کی پوری مخالفت کی تھی۔ اور جب فیصلہ شمس الدین احمد خاں کے حق میں ہو گیا تو اس نے دوبارہ صدر میں اس کے خلاف لکھا اور خود امین الدین احمد خاں کو مشورہ دیا کہ وہ کلکتہ جا کر اس فیصلے کو تبدیل کرانے کی کوشش کریں۔ امین الدین احمد خاں کلکتے جانے لگے تو غالب نے بھی اپنے کلکتے کے دوستوں کے نام سفارشی خط لکھے جو کلیات نثر فارسی کے حصہ مکاتیب میں شامل ہیں۔ امین الدین احمد خاں ستمبر ۱۸۳۴ء میں کلکتے پہنچے۔ آخر کار ان کی کوششوں سے پہلا حکم منسوخ ہو گیا اور لوہارو ان دونوں بھائیوں کو واپس مل گیا۔

نواب شمس الدین احمد خاں کا کہنا تھا کہ میں بے قصور ہوں میرا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ میرے دشمنوں کی جھوٹی شہادتوں کی بنا پر کیا جا رہا ہے جن کا سر غنہ مرزا فتح اللہ بیگ خاں ہے۔ مرزا فتح اللہ بیگ خاں شمس الدین احمد خاں کی اس پھوپھی کے بیٹے تھے جو احمد بخش خاں کے چچازاد بھائی محمد بخش خاں سے بیاہی تھی۔ دوسری پھوپھی غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کو بیاہی تھی اور لاولد فوت ہوئی تھی۔

غلام رسول مہر نے اپنی کتاب "غالب" میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک روایت دہرائی ہے (بہ حوالہ نواب ضمیر مرزا ابن نواب علاء الدین احمد خاں ابن ضیاء الدین احمد خاں) جو یوں ہے:-

"جب فریزر کی لاش دیوان خانے میں رکھی گئی، رؤسائے شہر اور حکام وہاں پہنچے تو ان میں فتح اللہ بیگ خاں بھی تھے جو فریزر کی لاش کو دیکھتے ہی اس پر گر پڑے اور بے اختیار چیخ پڑے "ہائے شمس الدین نے تجھے نہ چھوڑا۔"

بات لوگوں نے پکڑ لی اور پھر گو انہوں نے گریز کرنا چاہا مگر سود مند نہ ہوا۔"
(غالب، صـ۴۹)

غلام رسول مہر کا بیان ہے کہ شمس الدین احمد خاں اور فتح اللہ بیگ خاں کے درمیان رنجش کی ابتدا ایک گھوڑے کے متعلق مذاق سے ہوئی اور رفتہ رفتہ عداوت انتہا کو پہنچ گئی۔

لوگوں کو غالب پر بھی مخبری کا شبہ ہوا۔ اس کی کچھ بدیہی وجوہ تھیں۔ غالب شمس الدین احمد خاں کے سخت مخالف تھے، انھوں نے ان کے خلاف مقدمہ بھی دائر کر رکھا تھا۔ بہ قول مہر، شمس الدین احمد خاں خاندان لوہارو کے واحد فرد ہیں جن کے لیے کبھی کوئی کلمۂ خیر غالب کی زبان یا قلم سے نہیں نکلا۔ ولیم فریزر غالب کا محسن اور مربی تھا۔ اور مجسٹریٹ شہر کے ساتھ بھی جو اس مقدمے کی تفتیش کر رہا تھا غالب کا روز کا ملنا جلنا تھا۔ فروری ۱۸۳۵ء میں غالب کے خلاف ایک دیوانی مقدمے میں پانچ ہزار کی ڈگری ہو گئی تھی اور گرفتاری سے بچنے کے لیے غالب خانہ نشیں ہو گئے تھے۔ ان دنوں یہ دستور تھا کہ اگر مقروض کوئی صاحب حیثیت شخص ہے تو زرِ ڈگری کی عدم ادائگی کی صورت میں اسے تبھی گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ جب وہ اپنے مکان کی حدود سے باہر ہو۔ مگر اپنی اس احتیاطی خانہ نشینی کے باوجود غالب اس مقدمۂ قتل کی تفتیش کے دوران چوری چھپے مذکورہ مجسٹریٹ سے ملنے اس کے گھر جاتے رہے اتنا ہی نہیں جیسا کہ وہ ناسخ کے نام اپنے ایک فارسی خط میں خود اعتراف کرتے ہیں، مجسٹریٹ نے انھیں "پژوہش کار دحلّ اسرار" میں اپنا ہمراز بنا لیا۔

یہ کھلا اعتراف ہے کہ غالب نے نواب شمس الدین احمد خاں کے خلاف مخبری کی۔ ولیم فریزر کی رنگین مزاجی کے ضمن میں اوپر "بزم داغ" کے جس اندراج کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس میں نواب مرزا خاں داغ نے بھی کھلے لفظوں میں اپنے باپ کے خلاف مرزا فتح اللہ بیگ اور مرزا غالب کی مخبری کا ذکر کیا ہے

اور یہ تک کہا ہے کہ انھی دونوں کی مخبری کے نتیجے میں ان کے والد کو پھانسی کی سزا ہوئی۔

لمبی تحقیقاتی کارروائی کے بعد کریم خاں اصل قاتل قرار پایا اور اس جرم کی پاداش میں ۲۶ اگست ۱۸۳۵ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ مجسٹریٹ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ یہ قتل نواب شمس الدین احمد خاں کی انگیخت پر ہوا' اس لیے وہ بھی اسی سزا کے مستحق ہیں لیکن نواب چونکہ والیِ ریاست تھے اس لیے مجسٹریٹ کو انھیں سزا دینے کا اختیار نہیں تھا۔ اس نے مقدمے کے تمام کوائف' اپنا فیصلہ اور سزا کی تجویز گورنر جنرل کو کلکتہ بھیج دی۔ نواب نے اپنے وکیل مرزا اسفندیار بیگ خاں کو کلکتے بھیجا کہ وہ گورنر جنرل کے پاس عذرداری پیش کرے۔ وکیل نے کلکتے کے ایک انگریز سالسٹر چارلس تھیکرے کی وساطت سے درخواست دی جو بے نتیجہ رہی۔

۳۱ ستمبر ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل نے بہ اجلاس کونسل یہ فیصلہ صادر کیا کہ نواب شمس الدین احمد خاں کو مسٹر ولیم فریزر کے قتل کی انگیخت کے جرم میں پھانسی کی سزا دی جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کی صبح سخت حفاظتی انتظامات میں کشمیری دروازے کے باہر نواب کو پھانسی دے دی گئی۔ ایک گھنٹے تک لاش پھانسی پر لٹکی رہی' اس کے بعد نواب کے خسر مرزا مغل بیگ خاں کے حوالے کر دی گئی جنھوں نے اسے لے جا کر قدم شریف میں دفن کرا دیا۔ نواب شمس الدین احمد خاں کی عمر صرف ۲۵ برس تھی۔ (۱)

نواب شمس الدین احمد خاں کی ہلاکت کے بعد غالب کی ایک خواہش پوری ہوگئی: ریاست فیروزپور جھرکہ چونکہ بحق سرکار ضبط کرلی گئی۔ اس لیے غالب کو ان کی پنشن دلی کلکٹری سے ملنے لگی۔ مقدمہ ابھی چل رہا تھا۔ ۱۸ جون ۱۸۳۶ء کو لفٹنٹ گورنر غرب وشمال نے فیصلہ کیا کہ ۷ جون ۱۸۰۶ء کے شقے کے مطابق انھیں

---

(۱) ذکر غالب' مالک رام' ص ۵۶

جو ساڑھے سات سو روپے سالانہ ملتے ہیں، وہ اس سے زیادہ کے حقدار نہیں۔ غالب نے اس کے خلاف گورنر جنرل سے اپیل کی لیکن وہاں سے بھی اسی فیصلے کی توثیق ہوئی۔

۱۴ نومبر ۱۸۳۶ء کو غالب نے سرکار میں ایک اور درخواست گذاری جس میں کہا گیا کہ میرا مقدمہ صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے سامنے رکھا جائے۔ یا پھر کورٹ ڈائرکٹرز کے پاس ولایت بھیج دیا جائے۔ ۵ دسمبر ۱۸۳۶ء کو انھیں جواب ملا کہ ان کے مقدمے کے تمام کاغذات ولایت بھیج دیے جائیں گے۔ غالب نے ۲۶ دسمبر ۱۸۳۶ء کو پھر ایک درخواست دی کہ مئی ۱۸۰۶ء سے آج تک ہمیں دس ہزار سالانہ سے جتنا کم ملا ہے وہ دو لاکھ تین ہزار روپیہ بنتا ہے۔ یہ اس دو لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم سے وضع کر کے دے دیا جائے جو نواب شمس الدین احمد خاں نے اپنی وفات سے پہلے انگریزی خزانے میں جمع کرائی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمیں تین ہزار سالانہ پنشن کا اپریل ۱۸۳۵ء تک کا بقایا اس جائداد سے ملے جو نواب فیروز پور جھرکہ چھوڑ مرے ہیں اور تیسرے یہ کہ جب تک کورٹ آف ڈائرکٹرز کا فیصلہ نہیں آجاتا ہمیں تین ہزار روپے سالانہ باقاعدہ ملتا رہے۔ مگر یہ تمام درخواستیں بے نتیجہ رہیں اور ۱۸۴۲ء کے آغاز میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے بھی ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ غالب ہمت ہارنے والے نہیں تھے، انھوں نے ۲۹ جولائی ۱۸۴۲ء کو اس فیصلے کے بھی خلاف بہ طور اپیل ایک عرضداشت ملکۂ معظمہ وکٹوریہ کی خدمت میں بھجوانے کے لیے گورنر جنرل کو بھیجی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

جیسی کہ اوپر تفصیل دی گئی ہے، مقدمے کے شروع میں غالب کے بنیادی مطالبے پانچ تھے۔ تین کا فیصلہ قطعی طور پر ان کے خلاف ہوا۔ چوتھا نواب شمس الدین احمد خاں کے پھانسی پا جانے سے خود بخود پورا ہو گیا کیونکہ فیروز پور جھرکہ کی ریاست ضبط ہو گئی اور اس سے متعلق دوسری پنشنوں اور

وظیفوں کی طرح غالب کی پنشن بھی انگریزی خزانے سے ملنے لگی۔ ان کا پانچواں مطالبہ بھی رفتہ رفتہ پورا ہو گیا تھا۔ دربار کا حق انھیں لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد میں ملا جب وہ مقدمے کی پیروی کے لیے کلکتہ جا رہے تھے اور خلعت کا اعزاز لارڈ ڈالن برا کے عہد میں (۴۴-۱۸۴۲ء) جب یہ مقدمہ ختم ہونے کو تھا۔ انھوں نے ۱۸۴۲ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کے فیصلے کے خلاف ملکۂ معظمہ کو جو عرضداشت بھیجی تھی اس کا کورٹ کے فیصلے پر تو کوئی اثر نہ پڑا لیکن شاید ان کی اشک شوئی کے خیال سے انھیں درباروں میں سیدھے ہاتھ کے دسویں نمبر پر کرسی نشینی کے علاوہ خلعت کا مزید اعزاز عطا کیا گیا تھا جو اس عہد کا ایک بڑا اعزاز تھا۔

مرزا غالب کا مشہور مقطع ہے

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالب کی سیرت و شخصیت کو سامنے رکھا جائے تو کہنا پڑے گا کہ یہ ایک شاعرانہ تعلّی کے سوا اور کچھ نہیں۔ صوفیا اور اولیا کی زندگیاں قناعت پسندی، توکّل اور اللہ کی مخلوق کی بلا لحاظِ دوست دشمن، خیر خواہی کی جو مثالیں پیش کرتی ہیں، غالب کی زندگی پر ان کی ایک ہلکی سی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی۔ وہ زندگی بھر ہوسِ زر اور حبِّ جاہ کے اسیر رہے، جلبِ منفعت کے لیے انھوں نے تملّق پیشگی بھی اختیار کی اور اگر کسی کی طرف سے انھیں اپنے مفادات پر ضرب پڑتی نظر آئی تو اس کی مخالفت میں انھوں نے غیر اخلاقی حربے آزمانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ شمس الدین احمد خاں کے خلاف ان کی مخبری کو بھی ان کے اسی رویّے کی ایک مثال سمجھنا چاہیے۔

شاہد ماہلی

غالبؔ اور اُن کے چند معاصرین

دہلی کے اُجڑنے کے بعد جب اِس ویرانے میں دوبارہ کچھ آبادی ہوئی اور اِس بہارِ عارضی کے بلبل شاہ نصیرؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ، جعفر علی خاں زکی وغیرہ نوا پیرا ہوئے تو اُن میں سے بعض مخصوص مزاج و حالات کے تحت لکھنوی مضامین و موضوعات کے حامی دکھائی دیئے لیکن جن لوگوں نے دہلوی مضامین و موضوعات کو اپنایا اُن میں مرزا غالبؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخ اور حیدر علی آتش کا طوطی بولتا تھا اور اُنہوں نے زبان و اسلوب کی کئی پرانی روایات کو منسوخ اور نذرِ آتش کر دیا تھا۔ ان کی غزلیں برابر دہلی پہنچ رہی تھیں اور اپنا رنگ جما رہی تھیں۔ شاہ نصیر خود بھی دو دفعہ لکھنؤ گئے اور وہاں کے اساتذہ سے شاعرانہ چشمکوں اور معرکوں کا اتفاق ہوا انہوں نے مشکل زمینیں اختیار کر کے اپنی قادر الکلامی اور استادی کا مظاہرہ

کیا۔ شیخ ابراہیم ذوق تو آسمانِ اُردو پر انوری اور خاقانی بن کر اُبھرے ہیں وہ تصوّف میں ایک عالم خاص تھے۔ محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ اس فن میں جب وہ تقریر کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ بایزید بسطامی بول رہے ہیں اور وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر گفتگو کرتے تھے تو کبھی ابوسعید ابوالخیر اور کبھی محی الدین ہو جاتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے سچ کہا کہ اُن کے کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہیں مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انہیں ایسی شان وشکوہ کی کرسیوں پر بیٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں انہیں قادرالکلامی کے دربار سے ملک سخن پر حکومت مل گئی ہے۔ اہل شہر کو ذوق پر فخر تھا عوام اور خواص دونوں انہیں اقلیم سخن کا شہنشاہ تسلیم کرتے تھے۔ مرزا غالب بھی ان کی شہرت ومقبولیت اور ان کے منصب ومرتبہ سے واقف تھے۔ وہ بھی ان کی علمیت وقابلیت اور صلاحیت کے معترف تھے انہیں یہ بھی یقین تھا کہ ذوق کی شہرت ومقبولیت کا خاص سبب قلعہ معلی سے تعلق اور ان کی عام فہم اور سلیس وفصیح زبان اور ان کا دلکش اندازِ بیان ہے۔ لیکن وہ اپنی فطرت سے مجبور تھے۔ ان کو اپنے خاندانی وقار اور ذاتی وجاہت کا شدّت سے احساس تھا۔ وہ اپنی شاعرانہ عظمت اور صلاحیت پر نازاں تھے۔ ان محاسن کے باوجود جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی قدر اُن کے مرتبہ اور وقار کے بموجب نہیں ہو رہی ہے اور استاد ذوق کے مقابلے میں تو نہ ہونے کے برابر ہے، تو ان کے دل میں اس خیال کا پیدا ہونا یقینی تھا۔

بنا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

کبھی کبھی غالب بھی طعنہ ہائے رقیب سے جزبز ہو کر اپنے کلام کے بے معنی ہونے کا اقرار کر لیتے ہیں مگر اپنے حریف پر طنز بھی کرتے جاتے ہیں جو ستائش کی تمنا اور صلے کی غرض سے

شاعری کرتا ہے:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس کے ساتھ ساتھ وہ بڑے فخر کے ساتھ اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ مرے کلام میں ہر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

غالبؔ اور ذوقؔ دونوں اعلیٰ تہذیبی قدروں کے حامل اور محافظ تھے دونوں جس ماحول میں رہتے تھے وہ بھی معیاری اور مثالی تھا اس لیے تہذیب واخلاق، شرافت وانانیت سے گری ہوئی بات کسی کی طرف سے کبھی نہیں ہوئی۔ سہرے والے واقعہ میں بھی غالب نے عالی ظرفی اور صلح پسندی کی جو مثال قائم کی، اُردو ادب کی تاریخ میں وہ یادگار رہے گی۔ اس واقعہ سے غالب اور ذوق کے ادبی معرکے کو شہرت اور اہمیت حاصل ہوئی نواب زینت محل نے مرزا غالب سے فرمائش کی کہ وہ شہزادہ جواں بخت کے لیے سہرا لکھیں۔ غالب نے اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھا۔ سہرا کہا، اس کو زرنگار کاغذ پر لکھوایا اور سونے کی کشتی میں رکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ سہرے کے مقطع میں غالب کا یہ شاعرانہ دعویٰ معرکہ آرائی کا سبب بنا۔

ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں

دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

بہادر شاہ ظفر کو شاید یہ خیال آیا کہ غالب نے اس شعر میں ہم پر طنز کیا ہے۔ ہم نے جو شیخ محمد ابراہیم ذوق کو اپنا استاد بنایا ہے اور ان کو خاقانی ہند کا خطاب سے نواز ہے۔ یہ ہماری سخن فہمی

نہیں بلکہ ایک طرح سے بدذوقی ہے کہ ذوق کو اعلیٰ درجہ کا شاعر سمجھتے ہیں۔ اس لیے غالب کو جواب دینا ضروری ہے۔ جیسے ہی ذوق حاضر خدمت ہوئے ظفر نے غالب کا سہرا انہیں دکھا کر فرمائش کی کہ اس کا جواب لکھئے۔ ذوق نے اسی وقت غالب کے سہرے کا جواب لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا:

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے، ترا ذوق ثناگر سہرا
جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

بہادر شاہ ظفر بہت خوش ہوئے۔ غالب کو جواب مل گیا۔ اس ادبی حادثہ کا علم جب غالب کو ہوا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ بہادر شاہ ظفر سے انہیں یہ توقع نہ تھی کہ سہرے سے انہیں کسی قسم کی تکلیف پہنچے گی۔ معاملہ کی نزاکت کا غالب کو احساس ہوا اُن کی حاضر دماغی اور ذہانت مشعل راہ بنی اُنہوں نے وقت ضائع کیے بغیر فوراً بادشاہ کی خدمت میں یہ قطعہ معذرت کے طور پر پیش کیا۔

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا　　جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

سہرہ لکھا گیا زرہِ امتثال امر　　دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات　　مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ　　سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

حشمت بڑی ہے یہ طبیعت بڑی نہیں　　ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ　　کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

اس قطع سے بہادر شاہ ظفؔر کا دل صاف ہوگیا۔ حکیم مومن خاں مومؔن بھی دہلی کی نمائندگی کر سکتے تھے مگر انہوں نے اپنی شاعری میں عشق میں دنیاداری اور خیالات میں ایک خاص قسم کی مذہبیت کو جگہ دی ان دو وجوہ نے انہیں مومن زیادہ اور غزل گو کم رکھا زبان اُن کی بڑی صاف ہے ان میں نازک خیالی بے شک غالب سے بھی بڑھ کر ہے لیکن رعایت لفظی کی دوڑ میں لکھنؤ پہنچ جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ غالب نے غزل کو مئے دو آتشہ کی سی گرمی عطا کی۔ اس میں تغزل کے علاوہ دیگر مضامین کو بھی داخل کیا اور اپنی استادی وعظمت کی بے ساختہ داد وتحسین وصول کی۔ یہ بہت بڑی عظمت ہے مگر یہ امر مسلمہ ہے کہ آزاد فضا میں بہت کچھ کیا جا سکتا ہے، کمال تو یہ ہے کہ خود ساختہ قیود کو اپنے اوپر عائد کر کے تصور کو معراج کمال پر پہنچا دیا جائے۔ مومؔن واقعی اس کے مصداق ہیں انہوں نے غزل کو مضمون آفرینی نزاکت خیال، معاملہ بندی، طنز ومزاح، وغیرہ حسین وخوشنما زیوروں سے آراستہ کر کے عروس ادب بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ غالب نے بھی قریب قریب انہیں زیورات سے اپنی غزل کی حسن آفرینی میں اضافہ کیا۔ موازنہ کے ذریعہ آج یہ طے کرنا ہے کہ منظرِ انتخاب میں ہر دو حضرات کن مقامات پر مماثل نظر آتے ہیں اور کن مقامات پر ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں۔ مومؔن کہتے ہیں:

جلتا ہوں ہجر شاہد و یاد شراب میں شوق ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

غالب کہتے ہیں:

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

مومن اس معاملہ میں ہمیشہ مومن رہے۔ انہوں نے کبھی شراب سے اپنے لبوں کو آلودہ نہ ہونے دیا اور دوسروں کو بھی شراب نوشی سے منع کیا مگر زاہد خشک کی طرح نہیں بلکہ وہی لہجہ رندانہ اختیار کرتے ہیں جو ایک تجربہ کار سرمست شراب کو ہو جانا چاہیئے لہٰذا اثر سے خالی نہیں۔ دنیائے تخیل مومن اور غالب دونو کی علیحدہ ہے۔ دونوں اپنے پنے مقام پر تحسین و آفریں کے مستحق ہیں۔ مومن نے حسن طلب سے معشوق کو نگاہِ بے حجاب پر اُبھارا ہے اور خوف بدنامی کو اپنے گریۂ رسوا سے دفع کیا۔ غالب نے ایک ادائے ناز کی تصویر کشی کی ہے۔ مومن کہتے ہیں:

دعا بلاتی شب غم سکون جاں کے لیے سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

غالب کہتے ہیں:

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لیے رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لیے

دونوں شعر قابلِ داد ہیں اور ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ مرزا کہتے ہیں کہ دوست نے آسمان کے لیے کوئی اندازِ ستم باقی نہ چھوڑا پس دوست کی بیداد آسماں کے ستم سے امن دینے والی نوید ہے۔ مومن کہتے ہیں کہ ہم نے شب غم سکون جان کے لیے جو دعا مانگی وہی مرگ ناگہاں کے لیے بہانہ بن گئی اور اس نے آ کر قصہ تمام کر دیا۔ یہاں دونوں کا موازنہ ضروری نہیں ہے بلکہ یہ دونوں اُردو ادب کی وہ عدیم المثال ہستیاں ہیں کہ دنیائے ادب رہتی دنیا تک ان کے احسان کو فراموش نہیں کر سکتی اگر غالب شہنشاہ سخن ہیں تو مومن تغزل کے امام ہیں لہٰذا ہم کسی کو کسی سے بلند اور ارفع نہیں قرار دے سکتے۔

غالب کی علمی استعداد اور اُن میں خاندانی برتری اور شخصیت کی بلندی کے احساس نے انہیں دوسرے شاعروں کی طرح سنگلاخ زمینوں میں ٹھوکریں کھانے۔ استعارات کے خیال خانوں میں گم ہونے اور تخیل کی بے پر کی اُڑان سے گرنے کی بجائے ایک اور ایسا پیچیدہ راستہ اختیار کرلیا جس کے مشکل اور اُردو میں نیا ہونے کے اعتبار سے ان کے احساس برتری کی تسکین بھی ہوئی۔ مرزا عبدالقادر بیدؔل کے تتبع کی بناء پر مرزا غالب ایک تو شاہ نصیر اور شیخ ابراہیم ذوق کی طرح لکھنوی شاعری کی پیروی سے بچے رہے اور دوسرے مرزا عبدالقادر بیدؔل میں فارسی شعرائے متاخرین کی خوبیوں کی بنا پر وہ ان کے رنگ پر آ گئے۔ غالب کے کلام میں تصوف کا وجودِ خصوصی مرزا عبدالقادر ہی کی پیروی اور انداز میں ہے۔ انہوں نے تصوف کی عام باتوں کی بجائے اس کے بعض مباحث خصوصاً مسئلہ وحدۃ الوجود کو اپنی شاعری کا اہم حصہ بنایا ہے۔ غالب خواجہ میر درد کی طرح ولی نہیں تھے البتہ ابراہیم ذوق کی مانند علم تصوف سے آگاہ تھے۔ اس لیے ان کے یہاں تصوف کے چند مباحث ضرور ہیں۔ غالب نے اُردو شاعری میں تصوف کے ذوق کو منتقل نہیں کیا تصوف کے مسائل داخل کئے ہیں جس کا احساس خود شاعر کو ہی تھا:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب　　تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تصوف دراصل ایک اندرونی تجربہ ہے۔ ایک عمل ہے جس میں واردات کی رو جلتی رہتی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا غالب کی زندگی اور شاعری پر یادگار غالب کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے اسی لیے غالب کے فلسفی ہونے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر نہیں کیا اور جن شعروں کو ہم ان کے فلسفیانہ شعر سمجھتے ہیں حالی نے انہیں تصوف کے عنوان کے تحت رکھا ہے۔ مرزا عبدالقادر بیدؔل کی پیروی کا دوسرا نتیجہ جو انہیں اپنے تمام ہمعصر شعراء سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ کہ غالب نے عرفان کی باریکیوں کی طرح طرز ادا میں پیچیدگی پیدا کی جس سے لوگ

مرزا کی ستائش شعری بہت کم کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب مرزا غالب کو چند معتدل طبیعت اور سلیم مزاج لوگوں خصوصاً مولانا فضل حق خیر آبادی کی صحبت میسر آئی تو مرزا نے یہ راز پالیا کہ پہاڑ کھودنے سے ویرانہ دل کھودنا بہتر ہے یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نواب میر ظفر علی خان اسیرؔ کا طوطی بول رہا تھا ریاض نے اسیرؔ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا اسیر اگرچہ ریاض سے بہت محبت کرتے تھے لیکن خود ریاض اُن سے زیادہ مانوس نہ ہو سکے۔ ابتداء میں ان پر غالب کا رنگ غالب تھا چاہتے تھے کہ انہی کی طرح مشکل الفاظ پُر پیچ ترکیبوں اور ثقیل جملوں کو استعمال کر کے استاد (اسیرؔ) پر اپنی دھاک بٹھائیں۔ خود ریاض خیر آبادی کا بیان ہے:

''میں نے ابتدائے مشق سخن کے لیے دیوانِ غالب کو پسند کیا تھا۔ دیوانِ غالب کے اشعار پر بہ ترتیب قافیہ پیائی کرتا۔ کلام جناب تدبیر الدولہ مدبّر الملک منشی مظفر علی خاں اسیر شاگرد مصحفی کو دکھاتا۔ اسیر مرحوم مجھ سے محبت کرتے مگر مرحوم کی خدمت سے میں اکثر اس لیے پژمردہ واپس ہوتا کہ جناب اسیر بساط نیشان صحبت کو میرے اشعار بوجھتے کہہ کر سناتے۔ یہ امر خفت کا باعث ہوتا یہاں تک کہ آخر میں اس خاص رنگ کا دیوان اور کلام تلف کر دینا پڑا۔ طبیعت صفائی کلام اور صحت کی طرف رجوع ہوگئی۔ سیتاپور اور خیر آباد میں شاعروں کا زور تھا۔ خیر آباد کے مشاعروں میں حضرات سیتاپور بہ خصوصیت شریک ہوتے۔ سیتاپور کے مشاعروں نے پچھلی نمود کو اور ترقی دے دی۔

(نثر ریاض خیر آبادی، صفحہ ۲۶۔۲۷)

اس بزم سخن کے ایک رکن امام بخش صہبائی بھی تھے جن کے متعلق اُن کے ایک

معاصر مولوی کریم الدین نے طبقات الشعراء ہند میں لکھا ہے:

''فارسی میں بڑی زبردست قدرت رکھتے ہیں ہمارے زمانے میں کتب فارسی میں مثل ان کے کوئی ماہر نہیں''

اپنے معاصرین میں غالب و آزردہ کو انہوں نے نہایت انصاف پسندی اور فراخ دلی سے کئی جگہ خراج تحسین پیش کیا ہے:

چہ می بری بر آزردہ شعر صہبائی
کہ گرگہ است بہ میزانش کم زبانگ است

طاقت ہم طرفی غالب ندارد طبع من
پر پیش رفتم زنقشش گردہ برداشتم

نالۂ غالب و آزردہ زکف بردعناں
سوختم سوختم ازمائشِ گرم دم شاں

صہبائی کی متعدد غزلیں مثلاً گناہِ کیست، ہجرانم نمی آید۔ ہمدم شاں وغیرہ غالب اور دوسرے اساتذہ کی زمین میں ہیں۔ اہلِ ذوق ان کو پڑھ کر اُن کی اور دوسروں کی پرواز اور انداز بیان کے بارے میں رائے قائم کر سکتے ہیں۔ صہبائی کے قصائد ابوظفر بہادر شاہ، مسٹر ٹامسن اور مولانا آزردہ کی مدح میں ہیں جن میں ایک ان کے خداوندنعت دوسرے افسر اور تیسرے محسن ہیں۔ ان قصائد میں کافی مبالغہ اور تصنع ہے جیسا کہ عموماً قصاید میں ہوتا ہے۔ تاہم فنّی لحاظ سے یہ سب ان کی علمیت اور استادی کی دلیل ہیں۔ ان کی رباعیات میں کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کو زبان و بیان پر کامل قدرت ہے۔ اور کلام پختہ اور استادانہ ہے۔ دراصل صہبائی متاخرینِ شعرائے فارسی کے آخر دور کے افراد خصوصاً اسیر وشوکت سے زیادہ متاثر ہیں۔

صہبائی کی تعلیم وتربیت کی تفصیل تو نہیں ملتی مگر تمام تذکرہ نگار اُن کے علم وفضل کی تعریف میں یک زبان ہیں۔ اور خود ان کی تصانیف اس امر کی شاہد ہے۔ صہبائی کے استاد عبداللہ خاں علوی ایک فاضل عصر شخص تھے جن کی سخنوری کے غالب بھی معترف ہیں۔ ان کا وطن تو شمس آباد تھا لیکن ایام طفلی سے دہلی میں سکونت تھی۔ ان کے علم وفضل عربی و فارسی کی مہارت، ادب وانشا پر قدرت کا تفصیلی بیان آثارالصنادید میں موجود ہے۔ آثارالصنادید میں سر سید لکھتے ہیں۔

اس جزو زماں میں ایسی جامعیت کے ساتھ کوئی نظر سے گزرا ہے اور طرفہ یہ ہے کہ فنون متعارفہ سخنوری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقامات کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و استکمال فن معما وغیرہا سے ایسا کمال بہم پہنچایا ہے کہ ہر فن سے یک فنی کہنا چاہیئے۔ کتب اور رسائل قواعدِ زبان فارسی اور رسائل علم عروض و قافیہ و معما جو آپ کے پنجۂ قلم نزاکت رقم ہیں ایسے نفائس مقاصد اور جلائل مطالب پر مشتمل ہیں کہ متنعان فنونمذ کو ان قوائد جلیلہ کا حصول بعد ایک عمر دراز کے بھی متعسر ہے۔

گارسن دتاسی رقم طراز ہے:

مولانا صہبائی منشی عبدالکریم کے ہم عصر ہیں اور منشی اپنے تذکرہ شعراء میں بیان کرتے ہیں کہ یہ قابل مصنف دہلی میں فارسی کے سب سے زیادہ فاضل ادیب تصور کیے جاتے ہیں۔

صہبائی شروع میں بعض اہل ثروت کے یہاں مدرسی یا اتالیقی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کریم الدین نے ان کی علمیت۔ ظرافت اور اعلیٰ سیرت کی بہت تعریف کی ہے۔ ۱۸۴۰ء میں وہ دلی کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہو گئے۔ ان کے تقرر کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ جب گورنمنٹ نے طے کیا کہ کالج میں کسی قابل فارسی استاد کا تقرر ہونا چاہیئے تو منشی صدرالدین آزردہ

نے بتایا کہ دہلی میں فارسی کے تین بڑے ماہر ہیں۔ غالبؔ، مومنؔ، اور صہبائی، آثار الصنادید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کی دہلی بڑے بڑے علماء، حکما اور شعراء کا مرکز تھی۔ مولانا فضل امام، مولانا فضل حق، مولانا مملوک العلی، شمس العلماء ضیاء الدین، حکیم احسن اللہ خاں، ممنون، نصیر، مومن، ذوق، غالب، صہبائی، آزردہ، شیفتہ، ایسے کاملین فن تھے جن کی شخصیتیں غزنوی اور سلجوقی عہد کے اکابر کی یاد دلاتی تھی اور جن کی صحبتوں میں علم و حکمت کی شراب کے دور چلتے تھے۔ صہبائی اسی علمی حلقے کے ایک رکن رکین تھے اور ان کے ان مشاہیر میں سے اکثر سے خصوصی روابط تھے۔ مرزا غالب نے بھی ایک غزل میں بہت خوبی کے ساتھ اپنے معاصر فارسی شعرائے دہلی کا حوالہ دیا ہے لکھتے ہیں:

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایانِ عجم
چہ بمامنت بسیاہی از کم شاں
بند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیرّ و صہبائی و علوی و آنگاہ
حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں گرچہ منیر زد بہ شمار
ہست در بزم سخن ہمنفس و ہمدم شاں

صرف صہبائی ہی نہیں بلکہ اس دور کے بیشتر شعراء فارسی دانی میں کافی مشہور تھے۔ اس دور کے فضلاء کی علمیت کا اقرار خود حالی بھی کرتے ہیں:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر بھول نہ جانا ہرگز
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

چپے چپے میں ہیں یا گوہر یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

انہیں فضلاء و شعراء کے متعلق یادگارِ غالب میں حالی لکھتے ہیں کہ:

اگرچہ ان بزرگواروں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو ظاہراً مرزا کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ سب سخن فہم اور سخن سنج تھے۔ اس لیے جس طرح قدردانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا۔ اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا۔ اور ان کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لیے اظہارِ کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی۔ اور اس طرح قدرداں اور نکتہ چیں دونوں ان کی ترقی کے باعث تھے۔ (یادگارِ غالب)

حالی نے اس بیان سے نہ صرف غالب کی شاعری کا پس منظر پیش کر دیا ہے بلکہ اس

پس منظر کا وہ پیش منظر بھی ظاہر کر دیا ہے جس سے مابقت کی کارفرمائی سے معرکہ کائنات برقرار رہتا ہے۔ حالی کے اس قول سے غالب کے متعلق یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ وہ اظہارِ کمال میں زیادہ کوشش کرتے تھے۔ خود غالب اپنی غزل کی خصوصیت کا ذکر مختلف مکاتیب میں کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''فارسی کی ترکیب اور فارسی اشعار کے معنی کے پرواز میں میرا قول اکثر جمہور پائے گا'' (اردوئے معلی صفحہ ۶)

دوسری خصوصیت کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو

(خطوطِ غالب صفحہ ۳۲۱)

یہ ان کو بعد میں ہوا ہوگا۔ تاہم: کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور۔ یہ اندازِ بیان خلاف جمہور ہی تھا اور اسی وجہ سے ان کے کلام میں بڑی دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔ صہبائی کا کلام بظاہر عاشقانہ ہونے کے باوجود اس اندازِ بیان سے خالی ہے لیکن وقتِ نظر کا شاہد ہے۔ صہبائی کا مضمون عام طرز کا ہے۔ اس میں جدّت اور نُدرت نہیں ہے جو غالب کا خاصہ ہے۔ ہم یہاں دونوں کی چند متحد البحر غزلوں کے اشعار کا موازنہ پیش کرتے ہیں۔ غالب کا مطلع ہے:

سوزِ بسکہ تابہماش نقاب را
داتم کہ درمیاں نہ پسند و حجاب را

اسی مضمون کو انہوں نے اُردو شعر میں بھی بیان کیا ہے کہ:

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منھ چھپائے کیوں

اُردو شعر میں حسن مضمون اور اس کا حسن تعلیل یقیناً بہت خوب ہے اسی قافیے میں صہبائی کہتے ہیں:

پسند عزّہ بر رخِ خود ماہتاب را

یک شب بیاز چہرہ ہر افگن نقاب را

غالب کا ایک اور شعر ہے:

سوزد زگر میش دم اور ہمچناں بہ لہو

ریزد زآبگینہ بساغر شراب را

اسی مضمون سے کچھ قریب غالب کا اُردو شعر ہے:

ہاتھ دھو دِل سے یہی گرمی گر اندیشے ہیں

آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلا جائے ہے

صہبائی مختلف کہتے ہیں لیکن تشبیہ خوب استعمال کرتے ہیں:

کن آشنائے لب دوسہ عرفِ عتاب را

از بہر مادہ آتشہ ساز ایں شراب را

ناسخ کے کلام کو بھی غالب عزت کی نظروں سے دیکھتے تھے اور روایت یہ بھی ہے کہ وہ ایک عرصے تک ناسخ کو مانتے بھی رہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ناسخ کو اس سے بہتر خراج تحسین نہ کسی نے ادا کیا نہ کوئی ادا کر سکتا ہے تو آخر کیا وجہ کہ غالب کو ناسخ کے کلام میں کون سی ایسی خوبی نظر آئی جو باقی ہر کسی کی نظر پوشیدہ رہی۔ اوّل تو یہ کہ غالب کو ناسخ کے یہاں اسلوب کا رعب نظر آتا ہے۔ رعب دار ترکیبیں، پُر جوش لے، پُر خروش نوا۔ پڑھنے والا اس کی آواز سے ہنگامہ سا محسوس کرتا ہے۔ اس کا دِل ڈوبتا نہیں۔ اُبھرتا ہے اور زندگی سی محسوس کرتا ہے یہ شعر دیکھئے۔

مرا سینہ ہے مشرقِ آفتاب داغ ہجراں کا

طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا

.....

شفق سمجھا ہے اس کو ایک عالم وائے بے دردی
فلک کو گر بگولا جا لگا خونِ شہیداں کا

......

دیکھ اپنے روئے آتشناک کی تاثیر کو
تیرے نقشے نے جلایا کاغذ تصویر کو

الفاظ وتراکیب کے رعب کے ساتھ ساتھ اختراع کی ندرت وغرابت ہے جو پڑھنے والے کو واقعی چونکا دیتی ہے۔ پڑھنے والا متعجب بھی ہوتا ہے اور ذرا سی ہلچل بھی محسوس کرتا ہے اس تجربے میں وہ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ شعر حقیقت سے بہت زیادہ دور ہو گیا ہے اور جذبے کی سچائی غائب ہے مگر پھر بھی قاری ایک خاص قسم کا اثر لیتا ہے اور شاعر کے ہنر کا اعتراف کرنے پر مجبور سا ہو جاتا ہے۔ یہ خیال آفرینی یا مضمون آفرینی ہے۔ اور جدید دور کے اکثر ناقدوں نے اس کے خلاف لکھا ہے لیکن با این ہمہ، یہ اسلوب پرانے ہر دور میں موجود تھا اور خراج تحسین بھی وصول کرتا رہا۔ چنانچہ خود ناسخ اپنے دور میں استاد تسلیم کیے گئے اور غالب نے بھی اگر تسلیم کیا تو اسی وجہ سے کہ اس قسم کے اختراعی اسلوب کو ان کے زمانے تک لوگ فن کی ایک اہم صورت خیال کرتے تھے۔ اور شاید اس وجہ سے بھی کہ غالب کا اپنا ذہنی میلان بھی رعب دار اسلوب اور اختراعی مضامین کی طرف تھا اگرچہ ان کی فوقیت یہ ہے کہ ان کا کلام اس اسلوب کی وجہ سے بعید از حقیقت نہیں ہو گیا بلکہ سچے اور گہرے جذبوں سے پھر بھی معمور رہتا ہے۔ نسخہ حمیدیہ میں غالب کا جو کلام موجود ہے اس کا معتد بہ حصہ اسی اختراعی ندرت وغرابت کا نمونہ ہے بلکہ جو دیوان منتخب ہوا اس میں بھی غالب کا یہ میلان بار بار نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ غرابت واختراع کے باوجود غالب کے یہاں حقیقی معانی کا دامن ہاتھ سے بہت کم چھوٹتا ہے۔ مثلاً یہ غزل دیکھیے:

شب نمازِ شوقِ ساقی رُستخیز انداز تھا

تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا

جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن

دستِ مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

......

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدہ شوخیِ ناز

جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا

عجزِ ہمّت نے طلسم دلِ سائل باندھا

.....

شب کو وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا

رشتہ ہر شمع خارِ کسوتِ مانوس تھا

ان سب اشعار میں غالب نے اپنے معانی کے لیے ایک خاص زبان اختراع کی ہے۔ اگر خیالی مضمون کی اختراع کہیں ہے بھی تو وہ حقیقت کے اثبات کے لیے ہے نہ کہ مسخ حقیقت کے لیے۔ اب ایسے مقام پر اگر ناسخ ہوتے وہ حقیقی معانی کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے اور ایک اونچی مگر بے مقصدی بات رہ جاتی۔ ناسخ معانی کے لیے نئی زبان ایجاد نہ کرتے تھے بلکہ زبان کے لیے معانی ایجاد کرتے تھے وہ اختراعِ مضمون پر نظر مرکوز کرتے تھے اور اس کے لیے

غرابت وندرت سے معمور زبان گھڑتے۔ اس کی وجہ سے ان کا بیاں رعب دار اور ٹھاٹھ دار۔ اور مضمون تعجب انگیز ہو جاتا تھا مگر تاثیر غائب ہو جاتی تھی ان کے برعکس غالب کے بیان میں تاثیر و درد اور ندرت وغرابت دونوں کا اجتماع۔ وہ غرابت سے حقیقی معانی کے چمکانے کا کام لیتے ہیں۔ اس غرابت سے ان کے معانی بے اثر و بے منرہ نہیں ہوتے وہ عجیب وغریب معلوم ہونے پر بھی ایک اثر رکھتے ہیں۔ اور جہاں ثقالت اور غرابت کم ہے وہاں تاثیر ہی تاثیر ہے۔ غالب کا درج ذیل شعر عجیب وغریب اشعار میں سے ہے یہ اگر کسی اور کا ہوتا تو شاید اس کا ذکر بھی گوارا نہ ہوتا۔ مگر دیکھیے غالب کے قلم سے وارد ہو کر بھی یہ بامعنی ہو گیا ہے۔ یعنی حقیقت کو ساتھ لیے ہوئے ہے:

اسد ہم وہ جنون جولان گدائے بے سرو پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا

مقصد شعر یہ ہے کہ ہم اہل جنون گدائے بے سرو پا ہیں، ہم عالم وحشت میں صحرا میں اس تیزی اور شدّت سے دوڑتے پھرتے ہیں کہ آہوں کی پلکیں ہمارے پاؤں سے ٹکرا ٹکرا کر تیزی سے گزر جاتی ہیں۔ اس بے سروسامانی میں گویا یہی ہمارا پشت خار ہے۔ شعر میں ایک طرف جنون کی بے سروسامانی کی حالت کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اس شعر کو سمجھنے میں خاصی دقت ہوتی ہے لیکن جب ترکیبوں کی مشکل گرہیں کھل جاتی ہیں تو حقیقت خود بخود سامنے آجاتی ہے کیونکہ بنیادی مضمون واضح ہے۔ اس شعر میں بیضۂ فولاد میں سے کوئی بچۂ ہما کا پیدا نہیں ہوا۔ سیدھا سادہ سچا مضمون ہے جو ندرت وغرابت کے اسلوب میں بیان ہوا ہے۔ غالب و ناسخ میں یہی فرق ہے۔ غالب نے ناسخ کے حق میں اگر کچھ کہا ہے تو اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ وہ ناسخ کے کلام کا اگر کوئی پہلو اچھا لگا ہے تو وہ ہے ان کا تعجب انگیز اختراعی انداز نہ کہ ان کے مضامین شعری جن میں نہ درد ہے نہ تاثیر نہ حقیقت ہے نہ صداقت۔

ذکاؔ بھی غالب کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد تھے۔ جن کو غالب سے والہانہ عقیدت تھی تعجب تو یہ ہے کہ ذکا کو غالب سے ملنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ ان کی یہ عقیدت غائبانہ تھی۔ اسی لیے مرزا غالب ذکا کو دوست روحانی اور برادر ایمانی کہتے تھے۔ غالب کے جس کارنامے سے ذکا سب سے پہلے متاثر ہوئے ہیں وہ پنج آہنگ ہے اس زمانے میں ذکا اگرچہ ثاقب اور بینش سے استفادہ کرتے تھے اور یہ دونوں بزرگ مشہدی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن یہ خاندان کئی پشتوں سے ہندوستان میں مقیم تھا جو بیجاپور اور دکن کے دوسرے علاقوں میں سکونت اختیار کرتے ہوئے نیلور میں مقیم ہوا۔ ذکا کے بارے میں ملتا ہے کہ جب وہ حیدرآباد آئے اور یہاں انہیں دم لینے کی مہلت ملی تو انہوں نے اپنے یارانِ وطن کو اس نیت سے مرزا غالب کی طرف متوجہ کرنا چاہا کہ وہ لوگ متقدمین کی روش کو فرسودہ سمجھیں اور آہنگِ غالب کو اپنے لیے معیار بنائیں۔ ذکا نے جن حالات میں حیدرآباد کا سفر کیا وہ نہایت ناسازگار تھے۔ یہاں پہنچنے کے ایک سال تین مہینے سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد ۳ر اگست ۱۸۵۶ء کو انہیں سالار جنگ کے یہاں نوکری مل گئی یہ حیدرآباد میں نظم ونسق کی تبدیلیوں کا عظیم الشان دور تھا۔ نظم ونسق میں قدیم وجدید کے ٹکراؤ سے پیچیدہ صورتیں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔ جس میں دیانت داری کے ساتھ فرائض کو انجام دینا نہایت مشکل کام تھا اور ذکا اس میدان میں مبتدی تھے۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی دس سال کی الجھنوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> وہ سال بے عالمگی غرض و راز تعارض الزای درسرا بخامی امور مفوضہ خود نفس ہا سوختیم

غالباً یہی وہ الجھنیں تھیں جنہوں نے حیدرآباد پہنچنے کے فوراً بعد ذکاؔ کو غالب کی طرف متوجہ ہونے نہیں دیا۔ نیز ابتداءً وہ اس اُمید میں رہے ہوں گے کہ خود دہلی پہنچیں گے۔ اسی لیے

انہیں مرزا کو خط لکھنے کا خیال نہیں آیا لیکن یہ ایک دلچسپ اتفاق ہے کہ جب اگست ۱۸۶۱ء میں غالب نے اپنا منتخب دیوان ریختہ نواب سالار جنگ کو پارسل کے ذریعہ بھیجا تو اس کے کچھ دنوں بعد ہی ذکا نے پہلی دفعہ مرزا کو خط لکھ کر مخاطب کیا۔ اس خط کے مطالب کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

عالی خدمت نواب اسد اللہ خاں غالب تخلص آن کہ در حضرت او خامہ بہ عرضِ ادب است شاہِ مردانِ سخن غالب عالی نسب است بندگی ہا مقبول و کورنش ہا موصول باد۔ بندہ نے کبھی روئے خواجہ جنہیں دیکھا لیکن خوئے خواجہ کا گرویدہ ہو گیا ہے۔ اگر اس کا نام پوچھیں تو ذکا ہے اور مقام پوچھیں تو لا پتہ ہے۔ مخاطب کے کلام کی بلندی فکر اور دقتِ معنی تک پہنچنے کی کوشش میں میں نے فلک چہارم سے تحت الثریٰ تک کی سیر کی ہے۔ اس کو غلو نہ سمجھیں اور مستانہ کا اٹھنا اور گرنا سمجھیں۔ یہ جوش سے مراد کیفیت پنج آہنگ اور دستنبو اور مہر نیمروز ہے جن کا ایک ایک نسخہ حاصل کرنے کے لیے مجھے مہینوں جستجو کرنا پڑی۔ میں خوش قسمت ہوں۔ فرخ ہوں کہ ان سے جو نشاط حاصل ہوتی ہے اس کی حرص آج تک باقی ہے۔ اس خیال میں کہ کوئی شخص ہندوستان سے اس طرف کا قصد کرے گا اور جناب والا کا کلیات فارسی و ماہ نیمروز ماہ اس کے پاس ہوگا۔ سر راہ بیٹھا ہوا مسافروں کے نقش پا کی پرستش کر رہا ہوں۔ اگر اتنی پرستش آفتاب کی کرتا تو مجھے لعل ناب کا آب رنگ نصیب ہوتا اور اگر اس قدر انتظار باغبانی میں کرتا تو میرا نہال برگ و بار سے گل فشاں ہوتا۔ ان سب باتوں کے باوجود دل نشیں

کتابیں مجھے نہیں ملیں۔ لیکن میں نے آپ کو یہ طعنہ نہیں دیا کہ میں نے
ایک بیہودہ کوشش کی آرزو کا خون ہو گیا تب کہیں دل نے رہنمائی کہ کہ وہ
پھول جو بازار میں نہیں ملتا، گلستاں سے اس کی بھیک کیوں نہ درخواست
کی جائے۔ اسی اُمید میں یہ سطور تحریر کر رہا ہوں اور ایک کاتب مقرر کیا
جائے گا۔ جو وہاں صفحہ پر سیاہی اور یہاں میرے دل پر احسان کا نقش کھینچے
گا۔ (پتہ حیدرآباد دکن بہ دارالانشاہین دستور مختارالملوک بہ حبیب اللہ ذکا پرسد)

اس خط سے غالب کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ذکا نے یہ خط مختارالملک کی ایما پر لکھا ہے۔ اور ان کا ایسا سمجھنا فطری تھا۔ نواب مختارالملک کے دفاتر کے کسی اور صیغہ کے ملازم کا اگر ایسا خط جاتا تو شاید غلط فہمی پیدا نہ ہوتی۔ لیکن دفتر دیوانی کا دارالانشاء تھا ہی وہ صیغہ جہاں سے تمام خط و کتابت کی جاتی تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو غالب نے اس خط کا جواب احتیاط سے دیا اس میں ایک طرف تو ذکا کے حد درجہ عقیدت آمیز خط کی رعایت سے لب و لہجہ اختیار کیا اور دوسری طرف اس کی بھی وضاحت کر دی کہ انہیں احتمال ہے کہ شاید وہ خط نواب مختارالملک کی ایما پر لکھا گیا ہے اس خط کے مطالب درج ذیل ہیں۔

یزداں کو اس کی بخشندگی کا سپاس، بخت کو اس کی فرخی پر آفریں اور آرزو کو برآنے کی نوید بے شک ایک امید افزا خط ملا ہے۔ جسے میں فرد فہرست ساز و برگ سمجھتا ہوں جو بلندی سے زمین پر مجھے بھیجا گیا ہے۔ یہ ایک گنجینۂ گراں ہے جو از راہِ مہربانی مجھے بھیجا گیا ہے۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ میرے راستے میں رنگا رنگ متاع سعادت ہے اور گنجینۂ مراد کے ظاہر ہونے کا وقت آپہنچا ہے۔ ہر چند یہ خط منشور خدایگاں (یعنی مختارالملک کا خط) نہیں ہے لیکن میری فروغ مندی کا نشان ہے کہ مجھ گوشہ نشین کا نام اس دفتر ہمایوں میں لکھا گیا ہے۔

غالب بخود ببال کہ گشتیم روشناس

در دفتر و زیر نوشتندم نام ما

غالب کے ایک اور ہمعصر آزردہ تھے جنہیں غالب کافی عزیز رکھتے تھے۔ غالب نے تین اشخاص کے لیے قصیدے ازراہِ عقیدت یا محبت کہے ہیں ایک تو آزردہ کے لیے دوسرا نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور تیسرا ضیاءالدین احمد خاں نیّر رخشاں کے لیے حالی لکھتے ہیں:

مولانا آزردہ بے شک مرزا کی طرز خاص کو جو انہوں نے ابتداء میں اختیار کی تھی ناپسند کرتے تھے اور جو خیال کہ ابتداء میں مرزا کی نسبت مولانا کی خاطرنشیں ہوگیا تھا۔ وہ اخیر تک ان کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے اس میں اس مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے کہ مولانا اُن کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے قصیدے کی تمہید میں اپنے مصائب و آلام و شکایت روزگار وغیرہ کا بیان ہے اس کے بعد مدح کی طرف اس طرح گریز کرتے ہیں:

باچنیں اندہ کہ پُر گفتیم و دل خالی نشد

خواجہ گر اندہ گسار من نہ بودے وائے من

آنکہ دریکتائی وے درفنِ فرزانگی

متفق گردیدہ رائے بوعلی بارائے من

آنکہ چوں خواہد بناش نامہ نامی ساختن

برنگار و عقل فعالش کرم فرمائے من

دل بدیدیں وصفم نیاساید سخن کو بتہ کنید

آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ہمتائے من

آزردہ کے علم وفضل کا دبدبہ عام تھا۔ فرحت اللہ بیگ نے اس دبدبے کی تمثیلی مشاعرے میں ایک جھلک دکھائی ہے۔ اردو فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے اُردو کی غزل بالعموم ان کے علم کے بوجھ تلے دبی دبی سی تھی۔ غالب اپنے ایک خط میں اپنے ہمعصروں کو یاد کر کے لکھتے ہیں:

نظام الدین ممنون کہاں، ذوق کہاں، مومن خاں کہاں، ایک آزردہ سوخموش دوسرا غالب وہ بے خود و مدہوش، نہ سخنوری رہی نہ سخندانی کس برتے برتاپانی۔ ہائے دلّی۔ وائے دلّی بھاڑ میں جائے دلّی۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی، غالب شخصیت اور شاعری میں آزردہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

کیا علم دین و مذہب کیا فن شعر و داب، کیا تہذیب و تمدّن کا کچھ رکھاؤ اور کیا طب و حکمت سب ہی شعبے اپنی معراج کو حاصل کئے ہوئے تھے مولانا صدرالدین آزردہ شاعر بھی تھے اور عالم بھی، شریعت اور قانون کا جیسا انہیں علم تھا ویسا اس دور میں کسی کو نہ تھا ان کی ہر بات وزن رکھتی تھی اور ان کی رائے میں وقار تھا۔ سرسید نے آثار الصنادید میں ان کا علماء میں بھی ذکر کیا اور شعراء میں بھی، عربی علم وادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ان کی رہنمائی میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں عالم و فاضل بنے غالب ان کی پسندیدگی کی تمنا تمام عمر لیے رہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی آگے لکھتے ہیں:

> کسی شخص کو پرکھنے کا ایک قابل اعتماد ذریعہ یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کے گرد کیسے لوگ جمع ہو گئے ہیں یعنی اس کے ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز کون ہیں۔ غالب کی شخصیت کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے بھی لینا ضروری ہے کہ وہ مردم دیدہ مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مشرب خاص آزردہ و صہبائی....
>
> (غالب کی شخصیت اور شاعری، رشید احمد صدیقی)

غالب اس مشاعرے میں بہت بڑی کمی محسوس کرتے تھے۔ جس میں آزردہ اور صہبائی موجود نہ ہوں۔ انہیں ہی وہ فارسی شاعری کا پارکھی سمجھتے تھے اور ان کی موجودگی میں اپنا فارسی کلام پڑھنا اور اس کی داد حاصل کرنا انہیں مسرّت اور ایک طرح کا فخر دینا تھا۔ آزردہ غالب کے دوست بھی تھے قدردان بھی تھے اور محسن بھی۔ ایک بار ان کی عدالت میں غالب کے خلاف قرض کا مقدمہ آیا۔ انہوں نے فیصلہ تو غالب کے خلاف ہی دیا لیکن اس قرض کی ادائیگی اپنی جیب سے کردی لیکن نواب یوسف علی خاں والی رامپور کے یہاں غالب کا انداز اس کے برعکس تھا۔ وہ نواب کو لکھتے ہیں کہ آزردہ کی ذاتی ضروریات کے لئے ان کے پاس گزارے کے لیے کافی املاک ہے۔ ان کے ساتھ جو دوسرے لوگ ہیں اور جن کے وہ کفیل ہو رہے ہیں وہ کوئی ان کے خاص قرابت دار نہیں ہیں یہ محض اس لیے کیا کہ غالب کو خود اپنے لیے اور زیادہ مالی امداد حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ اور اس کے لیے وہ کبھی قرض کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی حسین علی خاں شاداں کی ضرورتِ شادی کا۔ اسی طرح جب نواب صاحب آزردہ کی تجہیز و تکفین کے لیے ایسی ہی امداد یا اس سے زیادہ کے امیدوار ہو جاتے ہیں۔ بہر کیف یہ صورت غالب کے ہمیشہ پیش نظر رہی ہے:

ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود

ناد در خلوت شان مشک فشاں ازدم شاں

مومن و نیّر و صہبائی و علوی و انگاہ

حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شاں

سرسید احمد خاں سے بھی غالب کے تعلقات کی داستان دلچسپ ہے ویسے تو غالب سرسید سے بیس برس بڑے تھے۔ سرسید ۱۸۴۷ء میں غالب کے بارے میں لکھتے ہیں:

راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آسکتا ہے اور چونکہ، دلہا را بدلہا راہ باشد۔ ان حضرت کو ہی شغف راقم کے حال پر ہے شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں ان کے ایک طرف تو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے خوشا از حال ان لوگوں پر جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں اور جواہر گرانمایہ کہ آپ سے حاصل کرتے ہیں۔

(آثار الصنادید، باب چوتھا ص ۱۳۸)

غالب سے بھی سرسید نے اپنے قدیم تعلقات اور غالب کی بصیرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آئین اکبری کی تفریظ کی فرمائش کی۔ غالب یوں بھی تفریظ کے میدان میں کم چلتے تھے اور سرسید جیسے جوہر قابل کے سامنے اپنے اصلی تار کو کیوں چھپاتے۔ ریاکاری شیوہ نہ تھا انہوں نے ایک منظوم تفریظ لکھی غالب نے سرسید سے کہا کہ دیکھو کلکتہ اور لندن کی طرف نظر اٹھاؤ اور وہاں اور یہاں اس قوم نے نئے آئین اور نئی قوتوں کو تلاش کرلیا ہے زندگی کے انداز اور آداب بدل دیے ہیں الفاظ

کی اُڑان کتنی تیز ہوگئی ہے۔ نئے علوم پر انسان کی دسترس دیکھو اس تقریظ میں سادگی اور زور اوج کمال پر ہے اشعار میں سحر بیانی کا جادو چھایا ہوا ہے۔ اس تقریظ کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

صاحبان انگلستان را نگر شیوہ و انداز اینان رانگر

تاچہ آئین ہا پدید آوردہ اند آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند

زین ہنر مندان ہنر بیشی گرفت سعی بر پیشیان پیشی گرفت

حق این قوم است آئین داشتن کس نیارد ملک بہ زین داشتن

داد و دانش را بہم پیوستہ اند ہند را صد گونہ آئین داشتن

آتش نرسنگ بیرون اور رند این ہنرمندان زخس چون آورند

پیش این آئین کہ وارد روزگار کشتہ آئین و گر تقویم پار

ہست اے فردانۂ بیداد مغز در کتاب این گونہ آئین ہائے نغز

چون چنین گنج گہر بیند کسے خوشہ زان خرمن چابیند کسے

طرز تحیرش اگر گوئی خوش است نے فروں از ہر چہ میچوئی خوش است

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است گر سرے است افسرنے ہم بودہ است

بندۂ فیاض را مشر بخیل نور میرزد در طب بازان بخیل

مردہ پروردن مبارک کارنیست خود بگو کانیز جز گفتارنیست

غالب کے بیشتر معاصرین کا تذکرہ ہمیں حالی کی شہرہ آفاق تصنیف یادگارِ غالب سے دریافت ہوتا ہے لہٰذا اس موقع پر ضروری ہے کہ حالی کا تذکرہ یادگارِ غالب کے حوالے سے ہو۔ حالی کے لئے جو سب سے دشوار گزار مرحلہ تھا وہ غالب کے فن پر محاکمہ حالی نظم جدید کے قائدوں میں سے تھے اور وہ مسدس میں ہمارے شعراء کو اایندھن کہہ چکے تھے وہ شاعری میں مبالغے سے

بیزار تھے اور شاعری میں سادگی کے قائل تھے مگر اُن کی تنقیدی بصیرت کا ثبوت یہ ہے کہ ان سب خیالات کے باوجود اول تو انہوں نے غالب کی جامعیت اور انفرادیت کو عالم آشکار کرنے کا بیڑا اٹھایا دوسرے مجموعی طور پر فن کار اور فن دونوں کی ایسی روشن تصویر پیش کی کہ ان کے بعد آنے والے نقاد ان کی رکھی ہوئی بنیاد پر غالب کے فن کے قصر بلند کے نقش و نگار نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حالی اس بات کو بھی برابر کہتے تھے کہ مرزا کی پوری زندگی میں ان کی شاعری اور انشا پردازی کے سوا ہمیں کچھ نہیں نظر آتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ صرف اسی کام نے ان کو بلند درجہ عطا کیا۔ غالب کے مطالعے کا جو معیار تھا اسے انہوں نے اپنے لیے سہل تر اور عوام کے لیے مفید تر طریقہ اختیار کیا انہوں نے کلام غالب کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ نظم اردو، نثر اُردو، نظم فارسی، اور نثر فارسی، انہوں نے غالب کے فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت استادوں کے کلام سے کر کے ان کے کمال فن کا ثبوت بہم پہنچایا۔ حالی نے غالب کی اردو شاعری کی چار خصوصیات کا ذکر کیا ہے جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ہیں جدّت مضامین، طرفگی خیالات، استعارہ، کنایہ، اور تمثیل جسے حالی ادب اور شاعری کی جان کہتے ہیں۔ حالی کے زمانے میں اردو تنقید اپنے ابتدائی مرحلے سے گزر رہی تھی اس زمانے میں اردو شاعری تصوف، اخلاق، بے ثباتی دنیا، اور رنج والم کی بات زیادہ کرتی تھی۔ اس لیے حالی کو زمانے کی روش کا ساتھ دینا پڑا لیکن اس سلسلے میں وہ ایک ایسا معیار دے گئے ہیں جو یقیناً قابل توجہ ہے۔ وہ شاعر کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کی بنا پر اُسے جانچتے پرکھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اردو شعرا میں غالب کے یہاں اپنے پیش رؤوں اور معاصروں سے زیادہ ایک حکیمانہ نظر ملتی ہے ایک دانشوری کا احساس ہوتا ہے وہ عشق میں مبتلا ہونے کے باوجود اسے خلل دماغ کہتے ہیں۔ ارضیت کی ایک واضح لہر کے باوجود وہ فریب ہستی سے بھی آگاہ ہیں۔ وہ زندگی کو ایک بچے

کی معصومیت اور حیرت، ایک جوان کی مستی اور سرشاری اور ایک عمر رسیدہ کے صبر اور تسلیم تینوں کے آئینے سے دیکھ سکتے ہیں زندگی کی پیچیدگی کا جتنا گہرا احساس غالب کے یہاں ملتا ہے اتنا کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملتا وہ ماضی کی رنگا رنگ بزم آرائیں اور گلشن نا آفریدہ کی فضا دونوں پر سایہ کیے ہوتے ہیں اور ساری انسانی برادری سے لولگائے ہیں مگر آدمی اور انسان دونوں کا فرق ان کی نظر میں ہے۔ان کے ذہن اور دل دونوں میں وسعت ہے۔مگر حالی کا ہم پر یہ احسان عظیم ہے کہ انہوں نے غالب کی شاعری کے ایک قابلِ قدر تعارف کے ساتھ انکی اُردو نثر یعنی خطوط کی نثر کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی انہوں نے بجا طور پر یہ دیکھ لیا کہ مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اُردو نثر کی اشاعت سے ہوئی۔ایسی نظم اردو اور نظم فارسی سے نہیں ہوئی۔ غالب نے جس طرح اپنے اندر کی شمع میں چراغاں کی سی کیفیت پیدا کی، جس طرح آپ بیتی کو جگ بیتی کا رنگ دیا جس طرح تلخی و ترشی، دُکھ، سُکھ میں جینے کا ایک سلیقہ اور مزاج میں ایک آن پیدا کی۔ جس طرح دوسروں پر ہنسنے کے علاوہ اپنے پر ہنسنے کا حوصلہ دکھایا اور ایک معنی میں جس طرح نثر کو شعریت کی روح سے آشنا کیا اس تک حالی ہی پہنچ سکے اور ان کی دعوتِ نظر نے ہی ہمیں یہ موقع دیا کہ ہم ان سے آگے دیکھ سکیں۔

....

ڈاکٹر خلیق انجم

غالبؔ اور قتیلؔ

غالبؔ ہندوستانی شعروادب کی دُنیا میں تاریخی شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ نہ صرف انیسویں صدی کے بلکہ آنے والے زمانے کے بھی عظیم شاعر ہیں۔ یہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہو کہ غالبؔ اپنے عہد کے ہندوستان کی تمام زبانوں کے سب سے بلند اور ممتاز شاعر ہیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ غالبؔ اُردو کے وہ پہلے شاعر ہیں، جن کی بدولت اُردو شاعری کو بین الاقوامی سطح پر قبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اُن جیسی شہرت حاصل کرنے والے ان کے بعد اُردو میں دوسرے شاعر صرف اقبال ہی ہیں۔ کلکتے کا ادبی معرکہ غالبؔ کی زندگی کا ہی نہیں، ایران اور ہندوستان کی فارسی زبان میں بھی ادبی نوعیت کا بہت اہم معرکہ تھا۔ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ اس معرکے کی بنیاد صرف ادبی اختلافات پر تھی۔ کلکتے سے متعلق غالبؔ کے فارسی اور اُردو خطوط، کلکتے اور پنشن سے متعلق دستاویزات کا مطالعہ کرکے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس معرکے کی بنیاد ادبی اختلافات سے زیادہ غالبؔ کی پنشن کا قضیہ اور غالبؔ کی حد سے بڑھی ہوئی انا تھی۔

"قاطع برہان" کا جو معرکہ ہوا تھا، اس میں یقیناً غالبؔ کی اپنی غلطیوں اور ان کی حد سے بڑھی ہوئی انا کو دخل تھا۔ لیکن کلکتے کے ادبی معرکے میں غالبؔ اور قتیلؔ دونوں ہی بے قصور تھے۔ غالبؔ کی ولادت سے تقریباً بیس سال قبل قتیلؔ کی وفات ہوگئی تھی۔

کلکتے جانے سے قبل غالب نے کبھی قتیل کو بُرا بھلا نہیں کہا اور نہ ہی اُن پر کوئی اعتراض کیا۔ اس ادبی معرکے کے لئے پنشن سے متعلق غالب کے مخالف مرزا افضل بیگ نے جال بچھایا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ کلکتے کے معرکے میں غالب پر جو اعتراضات کئے گئے تھے، وہ سو فی صدی غلط اور بے بنیاد تھے۔ یہ اعتراضات ان لوگوں نے کروائے تھے، جو چاہتے تھے کہ غالب ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کی نظر میں کم علم ثابت ہوں، تاکہ پنشن کے مقدمے کا فیصلہ اُن کے حق میں نہ ہو سکے۔ غالب کے مخالفین بہت چھوٹی چھوٹی حرکتوں پر اُتر آئے تھے۔ انھوں نے غالب پر الزام لگایا کہ وہ اپنا نام کبھی اسد بتاتے ہیں اور کبھی غالب۔ غالب کی آواز کو بے وزن کرنے اور انھیں نیچا دکھانے کے لئے شیعہ اور سُنّی کا جھگڑا اُٹھا کر اُن کے مذہبی عقائد پر بے ہودہ الزامات عائد کئے گئے۔ اس سب کے علاوہ کلکتے سے شائع ہونے والے "جامِ جہاں نما" میں غالب کی پنشن کے سلسلے میں ایک ایسا خط شائع کرایا گیا، جس سے غالب کے پنشن کے معاملے پر بہت بُرا اثر پڑ سکتا تھا۔ پنشن کے معاملے میں بے انصافی۔ اس سلسلے میں ان کے مقدمے اور دلّی سے کلکتے تک کے انتہائی تکلیف دہ سفر کا غالب کے دل و دماغ پر بہت بُرا اثر ہُوا۔ جس کی وجہ سے غالب نے بعض باتیں ایسی کہیں جو وہ عام حالات میں نہ کہتے۔ غالب زندگی بھر پنشن کے سلسلے میں ہونے والی ناانصافی کے لئے انتہائی بے بسی کے عالم میں تڑپتے رہے۔ ان کی پنشن اور کلکتے کے سفر اور قیام کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ لیکن نئی دہلی کے نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ان کے خطوط نے ان واقعات پر نئی روشنی ڈالی ہے، جن کی وجہ سے نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ میں نے نئی دستاویزات کی روشنی میں ان واقعات و معاملات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور ان اسباب کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے، جن کی وجہ سے قتیل، بیدل، غیاث الدین اور ہندوستان کے دوسرے شاعروں اور فرہنگ نویسوں کے نام سے غالب بھڑکتے ہیں اور اپنی فارسی دانی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ غالب عظیم شاعر تھے۔ لیکن فارسی زبان اور ادب پر

اُن کی نظر زیادہ گہری نہیں تھی۔ میرے اس بیان کی تصدیق "قاطعِ برہان" کے قضیے میں قدم قدم پر ہوتی ہے۔

اگر قتیلؔ کے عہد کی کتابوں اور فارسی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ قتیل اپنے عہد کے مقبول ترین اور ممتاز ترین فارسی دانوں میں تھے۔ پورے ہندوستان میں ان کے مداحوں، معتقدوں اور شاگردوں کی تعداد بے شمار تھی۔ اس عہد کا صاحبِ اقتدار طبقہ بھی قتیلؔ کی بہت عزت کرتا تھا۔ قتیلؔ کو فارسی سیکھنے کا جنون تھا۔ جب وہ لکھنؤ میں تھے تو ایرانیوں سے ان کے گہرے مراسم تھے، جن سے وہ فارسی زبان سیکھتے تھے۔ فارسی زبان پر قدرت حاصل کرنے کے لیے وہ ایران بھی گئے اور وہاں کے اہلِ علم کی صحبتیں اٹھائیں۔ ان کے بارے میں سرسید کے صاحب زادے سید محمود صاحب کا ایک لکچر "سید محمد خلفِ سید احمد خاں کے لکچر" در بارۂ اعلا مسلمانان" ۱۸۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ اس لکچر میں سید محمود نے مرزا قتیلؔ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

"فارسی دانی میں کون انکار کر سکتا ہے کہ مرزا قتیلؔ نہایت اعلا مرتبت شعرائے فارسی میں اپنے زمانے میں شمار ہوتے تھے اور ان کا نام اور کلام اب تک شہرۂ آفاق ہے۔ گو کہ مجھ کو معلوم ہے کہ اپنے زمانے کے ملک الشعرا دہلی، مرزا غالبؔ جن کو میرے والد ماجد بہ وجہ موروثی روابطِ خاندانی چچا کہتے تھے اور میں ان کو دادا کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔ انھوں نے قتیلؔ کے کلام پر اعتراض کیے، مگر اس قسم کے مباحثے کی نقادی . . . صرف عالی مرتبت . . . فارسی کے اساتذہ کا کام ہے . . . یہ اظہر من الشمس ہے کہ جب تک ہندوستان کے فارسی دانی کی تاریخ زندہ ہے قتیلؔ کا نام صفحۂ روزگار سے نہیں مٹ سکتا۔"[1]

امام بخش ناسخؔ سے قتیلؔ کے بہت گہرے مراسم تھے اور ناسخؔ بھی قتیلؔ کے علم و فضل کے مداح تھے۔ قتیلؔ کی وفات پر ناسخؔ نے ایک قطعہ تاریخ کہا۔ اس میں "سعدیِ شیرازیِ ثانی" سے مادۂ تاریخ نکالا۔ اس مادۂ تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناسخؔ، قتیلؔ کو

---

[1] قاضی عبدالودود، جہانِ غالبؔ، پٹنہ، ۱۹۹۰ء، ص ۶۱

کس مرتبے کا عالم اور ادیب سمجھتے تھے۔

غالبؔ پنشن کے سلسلے میں نواب احمد بخش خاں سے بات کرنے کے لیے ۱۸۲۵ء کے اواخر میں فیروز پور گئے تھے[1] وہاں سے انھیں نواب احمد بخش کے ساتھ بھرت پور جانا پڑا۔ کچھ عرصے بھرت پور میں رہ کر فیروزپور واپس آ گئے۔ یہاں سے وہ سر چارلس منکاف سے ملاقات کی امید پر فرخ آباد کے راستے کانپور کے لئے روانہ ہو گئے۔ کانپور پہنچتے ہی غالبؔ ایسے بیمار پڑے کہ بستر سے اُٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ چوں کہ غالبؔ کو شہر میں کوئی اچھا معالج نہیں ہُوا۔ اس لئے انھوں نے ایک پالکی کرائے پر لی اور لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہاں غالبؔ پانچ مہینے سے زیادہ بیمار رہے۔ لکھنؤ کی آب و ہوا غالبؔ کو راس نہیں آئی۔ باندہ کے نواب ذوالفقار علی بہادر سے غالبؔ کے بزرگوں کے پرانے تعلقات تھے۔ اس لیے غالبؔ جوں توں کرتے، گرتے پڑتے، کانپور ہوتے ہوئے باندہ پہنچے۔ کئی مہینے نواب صاحب کے ساتھ رہے۔ نواب صاحب کی ہمدردی اور تیمار داری سے غالبؔ کے مرض میں خاصا افاقہ ہو گیا۔

کلکتے میں غالبؔ کے ادبی معرکے کے سلسلے میں تین مشاعرے اہم ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا مشاعرہ ۸ جون ۱۸۲۸ء کو منعقد ہُوا۔ غالب ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء کو کلکتے پہنچے تھے۔ بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ان کے قیام کے ابتدائی پونے چار مہینے کے دوران کوئی اور مشاعرہ نہ ہوا ہو، لیکن اگر ہوا تھا تو غالبؔ کی تحریروں یا کسی اور ذریعے سے ہمیں اس کا علم نہیں ہوتا۔

ہماری معلومات کے مطابق پہلا مشاعرہ جس میں غالبؔ نے شرکت کی تھی، وہی ہے جس کا اہتمام غالبؔ کو ذلیل کرنے کے لئے مرزا افضل بیگ کے اشارے پر ۸ جون ۱۸۲۸ء کو مولوی عبدالکریم کے ایک عزیز نے کیا تھا۔ غالبؔ نے اپنے فارسی خطوط میں کلکتے کے ان تینوں مشاعروں کا ذکر خاصی تفصیل سے کیا ہے۔

۳ مئی ۱۸۲۸ء کے ایک فارسی خط میں نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالب کلکتے کے ادبی معرکے کے سلسلے میں پہلے مشاعرے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

---

[1] بعض محققین کا خیال ہے کہ غالبؔ بھرت پور جانے سے قبل دہلی آئے تھے۔ پھر واپس فیروز پور اور پھر بھرت پور گئے۔

(۵) مرزا افضل بیگ نے مشہور کر دیا، کہ غالبؔ قتیل کو بُرا بھلا کہتا ہے اور کلکتے کے سخنوروں کو کسی قابل نہیں سمجھتا۔ اس نے سب کو میرے خلاف بھڑکا دیا، اور لوگوں کو میرا مخالف بنا دیا۔ مولوی عبدالکریم[1] کے رشتہ داروں میں سے ایک صاحب نے مجھے خاص طور سے ذلیل کرنے اور نقصان پہنچانے کے لئے انجمن تشکیل دے کر مشاعرے کا اہتمام کیا۔ کلکتے کے شاعروں کو مدعو کیا اور مجھے بھی دعوت دی۔ ریختہ گو شعرا کو اُردو کا اور فارسی گو شعرا کو فارسی کا مصرع طرح بھیجا اور مجھے دونوں زبانوں کے، مصرعے بھیجے۔ چناں چہ جون کے مہینے کے پچھلے اتوار کو مشاعرہ منعقد ہوا۔ میں بھی شریک ہوا۔ میں نے دونوں زبانوں میں طرحی غزلیں پڑھیں خواص اور عوام دونوں نے میرا کلام پسند کیا۔ اہلِ انصاف کے ایک گروہ نے کہا کہ جس کی فصاحت کا یہ حال ہو' اس کے مقابلے میں قتیل کیا ہے۔ بلکہ اگر پچھلے شاعروں میں مثلاً اسیر، بیدل اور اس مرتبے کے دوسرے شاعروں سے غالبؔ ہم سری کا دعویٰ کرے تو کچھ غلط نہیں، بلکہ یہ دعویٰ غالبؔ کو زیب دیتا ہے مجھے خدا پر ناز ہے کہ جو ہنگامہ مجھے رسوا اور بے آبرو کرنے کے لئے برپا کیا گیا تھا۔ وہ میری شہرت اور اظہارِ کمال کا ذریعہ بن گیا۔" (فارسی سے ترجمہ)

دوسرا مشاعرہ

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مرزا افضل بیگ اور اُن کے ساتھیوں نے غالبؔ کو بے آبرو کرنے اور نقصان پہنچانے کے لئے مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ مگر اس مشاعرے میں غالبؔ کا کلام بہت پسند کیا گیا۔ حریف اپنا سا منہ لے رہ گئے۔ مگر ہمت پھر بھی نہ ہارے۔ کچھ ہی دن بعد ایک اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ غالب نے اس مشاعرے کی تفصیل محمد علی خاں، سراج الدین احمد اور کچھ دیگر لوگوں کو لکھی ہے۔ محمد علی خاں کے نام ایک فارسی خط میں غالبؔ لکھتے ہیں۔

"پوشیدہ نہ رہے کہ جب میں کلکتے پہنچا تو بے شمار لوگ مجھ پر ٹوٹ پڑے اور میری نکتہ چینی کرنے لگے اور غلطیاں نکالنے لگے۔ مجھے پریشان کرنے

کے لئے جو لوگ اکٹھا ہوئے، آپس میں مل کر انھوں نے میری مخالفت شروع کر دی۔ ہر طرف سے آ کر جمع ہو گئے اور اسے مشاعرے کا نام دیا۔ (یہ پہلے مشاعرے کا ذکر ہے)، اس صحبت (مشاعرہ) میں مجھ پر بہت مہربانی کی۔ (یعنی غالبؔ کو بہت داد دی) دوسری صحبت (مشاعرے) کے لیے حکیم ہمام کی غزل کا مصرع طرح کے طور پر دیا۔ حکیم ہمام کی غزل کا مقطع ہے:"

درمیانِ من و دلدار ہمام است حجاب

دارم امید کہ آن ہم زمیاں برخیزد

میں نے اس ردیف قافیے میں دس بارہ شعر کہہ کر مشاعرے میں پڑھے۔ ایک ہفتے بعد خبر ملی کہ ایک بے وقوف (بے دانش) نے میرے اشعار میں سے ایک شعر پر اعتراضات کر کے اہلِ معنی کی نظر میں خود کو رسوا کیا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

جزوے از عالم واز ہمہ عالم بیشم

ہمچو موی کہ بتان را زمیان برخیزد

اعتراض یہ تھا کہ "عالم" مفرد لفظ ہے۔ اس کے ساتھ "ہمہ" ربط نہیں آ سکتا کیوں کہ "عالم" خود مجموعہ ہے اور چار شربت اور نہر الفصاحت (قتیل کی تصنیفات سے یہ سند نہیں ملتی کہ "عالم" کے ساتھ "ہمہ" ترکیب پا سکتا ہے، ..... دوسرا اعتراض تھا کہ "بیشم" جائز نہیں ہے "بیشتر" کہنا چاہیئے۔ تنہا "بیش" نہیں کہا جا سکتا۔ (اور اعتراض تھا، کہ معشوق کی کمر پہ بال اُگنا عقلاً اور عادتاً ممکن نہیں ہے، دوسرے یہ کہ "رستن موئے و سبزہ" بھی "بال اُگنے کو" موئے برخاستن، یعنی "بال اٹھنا" نہیں کہا جا سکتا۔" لے

ایک ہفتے بعد بعد خبر ملی کہ ایک بے دانش نے شعر ذیل

لے نامہ ہائے فارسی، ص ۱۰۵ - ۱۰۶ -

جزوے از عالم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موی کہ بتاں را زمیاں برخیزد [1]

پر یہ اعتراض کئے ہیں : "ہمہ" لفظ "عالم" کے ساتھ جو مفرد ہے، درست نہیں۔" "چار شربت" "نہر الفصاحت" (یہ دونوں تصنیفات قتیل کی ہیں) خبری از آں ندارد۔ "بیش" کی جگہ "بیشتر" چاہیئے۔ رستن موی بر کمر معشوق عقلاً (بعض الفاظ ضائع)، رستن موی و سبزہ کو برخاستن سے تعبیر نہیں کرسکتے [2]

(فارسی سے ترجمہ)

تیسرا مشاعرہ

ادبی معرکے کا ہنگامہ تیسرے مشاعرے میں ہوا۔ اس مشاعرے میں غالب نے اعتراضات کے جواب دیے۔

"مختصر یہ کہ جب میں نے اعتراضات پر غور کیا اور معترض کو اپنے میزانِ نظر میں تول کر فیصلہ کیا کہ اعتراضات کا جواب دوں تو سوچا کہ معترض کے منہ لگنا مناسب نہیں۔ لیکن چوں کہ خوددار لوگوں کے لئے یہ فطری عمل ہے، کہ وہ حق گوئی سے کام لیتے ہیں اور اپنے حق کے لئے دوسروں کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ اس لیے اپنے حق کے لئے ستیزہ کاری بھی کرتے ہیں۔ میں نے خود کو جواب دہی پر آمادہ کیا اور میں نے طے کرلیا ہے کہ تیسری صحبت (مشاعرے) میں ان اعتراضات کے جواب دوں گا۔" [3]

(فارسی سے ترجمہ)

---

[1] اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین ہمام کی تھی اور شاعروں کو مصرعِ طرح دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ غالب نے یہ غزل کلکتے میں کہی تھی۔ اس غزل کا مقطع ہے ... گرو ہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب۔ رحم امید ہمانا زِ جہاں برخیزد۔ اس شعر میں مرزا افضل بیگ کیطرف اشارہ ممکن ہے اور اگر میرا یہ خیال درست ہے تو غالب کے شعر پر اعتراض کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ [2] کچھ غالب کے بارے میں ص ۲۵۱ تا ۲۵۰۔ [3] نامہ ہائے فارسی ص ۱۰۵

غالبؔ جواب دینے کے لئے تیار ہوکر تیسرے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ انھوں نے ایک فارسی خط میں تیسرے مشاعرے کی تفصیلات ان الفاظ میں بیان کی ہیں۔

"میں نے، تیسرے مشاعرے میں ان اعتراضات کا جواب دینے کے لئے خود کو تیار کیا۔ قسمت نے ساتھ دیا اور اہلِ حق کی تائید کے لئے مناسب طریقے سے حق ظہور میں آیا۔ اُن دنوں عجم کے سرکردہ لوگوں میں سے ایک صاحب سفارت کے لئے ایران سے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ منتظمین کی دعوت پر وہ مشاعرے میں تشریف لائے۔ انھوں نے سب کے شعر سُنے اور جب میری نوبت آئی تو ناآشنائی کے باوجود مجھ پر بہت توجہ کی اور خود کو میرا مشتاق ظاہر کیا۔ کچھ ایرانی اُن سے پہلے کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ ان ایرانیوں نے شاید میری نغز گفتاری کی ان سے تعریف کی تھی۔ جب انھوں نے میرا کلام سُنا اور تخلص دریافت کیا تو فرمایا کہ آپ واقعی سب سے اچھے شاعر ہیں اور سچ بات یہ ہے کہ آپ سب سے بہتر شاعر اور اسم بامسمیٰ ہیں۔ پھر اہلِ محفل کی طرف رُخ کرکے فرمایا کہ دوستو آپ کے درمیان یہ "نفس گداختہ" اور "خوبیں نوا" (یعنی غالبؔ)، غنیمت ہیں۔ انھیں ہر حال میں عزیز رکھیے، کیوں کہ شعر و شاعری سے قطع نظر یہ فارسی زبان کے عالم ہیں۔ اس گفتگو کے دوران میرے نطق کا گھوڑا دوڑا اور حق و انصاف کے میدان میں گردِ فتنہ اُڑنے لگی۔ جب میں نے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے لب کشائی کی تو سفیرِ ممدوح میرے ہم زباں ہوگئے۔ میری بہت تعریف کی اور معترضین پر خوب ہنسے۔ انھوں نے، میرے دعوے کے ثبوت میں اساتذہ کے کچھ اشعار جو پیش کیے، وہ مجھے یاد ہیں' ان میں ایک شعر "ہمہ" کے ساتھ "عالم" کی ترکیب کے جواز میں حافظ علیہ الرحمۃ کا ہے:

گرمن آلودہ دامنم چہ عجب
ہمہ عالم گواہِ عصمت اوست

دوسرا شعر مصلح الدین سعدی علیہ الرحمۃ کا ایک مطلع ہے :-

به جهان خرم ازانم که جهان خرّم ازوست
عاشقم برہمہ عالم که همه عالم ازوست

ایک اور شعر ہے مولانا نورالدین ظہوری علیہ الرحمۃ والغفران کا یہ شعر لفظ "تر" کے اضافے کے بغیر "بیش" کے استعمال کی سند کے طور پر ہے۔ شعر ہے۔

کم از آنم که در معذرتم باید زد
بیش از آنم که وہی خجلت تقصیر مرا

کسی استاد کا ایک اور شعر ہے۔ اس شعر سے تائید ہوتی ہے کہ "برخاستن" "روئیدن" کے مترادف ہے۔ شعر ہے۔

از رخ خط مشک سوده برخاست
آتش بہ نشست و دود برخاست

قصہ مختصر مشاعرہ ختم ہوا اور سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ اس مشاعرے میں جو لوگ شاعر اور غیر شاعر، موجود تھے اسفیر ہرات کی ان باتوں سے، ناراض ہوکر مجھ سے اور خفا ہو گئے۔ میری شکست میں ان کی اپنی برطائی نظر آئی۔ میری ایک اور غزل کے اس شعر میں خامیاں نکال کر میرے ساتھ ناانصافی کی۔ شعر یہ ہے :-

شور اشکی بہ فشار بن مژگاں دارم
طعنہ بر بے سروسامانیِ طوفان زدہٗ

پہلے تو یہ مشہور کیا کہ کسرہ "زدہٗ" کے ساتھ مضاف الیہ کی ضرورت ہے۔ جب انھیں جواب دیا گیا کہ "زدہٗ" کسرۂ اضافی نہیں ہے "یائے وحدت" ہے تو جزبز ہو کر رہ گئے۔ انھوں نے کہا کہ "زدہٗ" مفعول کے بغیر نہیں آتا اور یہاں مفعول ہے نہیں۔ چوں کہ اس اعتراض کا تفصیلی جواب مثنوی آشتی نامہ (غالب نے بعد میں جس کا نام "بادِ مخالف" رکھ دیا تھا، میں دے دیا گیا ہے۔ اس لیے یہاں اس کا

ذکر بے کار ہے۔"[1] (فارسی سے ترجمہ)

تیسرے مشاعرے میں اہم شخصیتیں تو خاموش رہیں۔ لیکن بقول غالبؔ کچھ کم مایہ اور کم رتبہ لوگوں نے غالبؔ پر اعتراضات کیے۔ غالبؔ ان اعتراضات کا جواب دینے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ انھوں نے اپنی دفاع میں بہت کچھ کہا ہوگا، جس کی وجہ سے زبردست ہنگامہ ہوگیا۔

اس مشاعرے کے بعد ان مشاعروں پر گفتگو کرتے ہوئے غالبؔ نے ایک فارسی خط میں سراج الدین احمد کو لکھا:۔

"انھوں نے فیل اور رخ کو بچا کر دشمنی کی بساطِ شطرنج کو کچھ پیادوں کی چال کے لئے وقف کر دیا (غالبؔ کا مطلب یہ ہے کہ اس معرکے میں اہم شخصیتیں ایک طرف ہوگئیں اور معمولی اور کم رتبہ لوگوں کو غالبؔ کے مقابل کر دیا۔"[2] (فارسی سے ترجمہ)

اس تیسرے مشاعرے میں معترضین نے بہت ہنگامہ کیا۔ نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں غالبؔ اس ادبی ہنگامے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس شہر (کلکتے) کے سخن فہموں اور نکتہ رسوں نے میرے اس شہر میں آنے کے بعد ایک بزم سخن تشکیل دی ہے۔ ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو مدرسہ سرکار کمپنی میں سخن فہم اور سخن سنج جمع ہو کر غزل خوانی کرتے ہیں۔ اچانک بادشاہ ہرات کے بھیجے ہوئے سفیر اس شہر۔۔۔۔ میں وارد ہوئے۔ اس انجمن میں تشریف لائے۔ اس شہر گرامی بقعہ کے فارسی گو شعرا کا کلام سُنا۔ میرے کلام کی بلند آواز سے داد دی اور کہا کہ اس کلام کی قدر ہندوستان میں کون کرے گا۔ وہ (غالبؔ) تو اس لائق ہے کہ ایران کے فصحا اس کا کلام سن کر لطف اندوز ہوں۔ پھر اہلِ محفل کی طرف رخ کر کے فرمایا کہ تم لوگوں میں یہ شخص (غالبؔ) مغتنم ہے۔ شعر و شاعری سے قطع نظر فارسی زبان کا عالم ہے۔۔۔۔۔۔۔ محفل

---

[1] نامہ ہائے فارسی، ص ۱۰۵، ۱۰۶۔ [2] مآثرِ غالبؔ، ص ۴۴

کے اکابرین اور گراں مایہ حضرات کو اس بات پر حسد ہوا اور انھوں نے میرے دو اشعار پر غلط اعتراضات کیے۔[1] (فارسی سے ترجمہ)

کچھ احمقوں نے ان اعتراضوں کو شہرت دی۔ جب میں نے ان اعتراضوں کا جواب دیا تو وہ خاموش ہوگئے۔ مخدومی و مکرمی نواب علی اکبر خاں دام اقبالہ اس قضیے میں میرے ہم زباں رہے۔ انھوں نے بڑے سلیقے سے اُن دیوانوں کو چپ کر دیا۔ چنانچہ فقیر نے نیازمندی اور خاکساری کے طور پر (مثنوی) لکھی ہے جس میں معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ یہ مثنوی آپ کی نظر سے بھی گزرنی چاہیے۔ انشاءاللہ بہت جلد اپنے خط کے ساتھ ارسال خدمت کروں گا۔[2]

غالبؔ نے تیسرے مشاعرے میں مخالفوں کو بہت برا بھلا کہا اور یہاں تک کہہ دیا کہ اس محفل میں کوئی مخاطب صحیح نہیں ہے۔ غالبؔ نے نواب محمد علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے۔

"ایک بزرگ نے نواب سید علی اکبر خاں کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ اسداللہ دہلوی جو آپ کے نیازمندوں میں ہے' محفلوں میں شوخی کرتا ہے اور لوگوں کا ادب نہیں کرتا۔ اپنی بات کہنے میں زباں درازی کرتا ہے' اور بات بات پر غصے ہو جاتا ہے۔ ہمارے مشاعرے میں سب کو برا بھلا کہا۔ اس مشاعرے میں' جس کا میں ذکر کر چکا ہوں' شاید میری زبان سے نکلا تھا کہ افسوس یہاں کوئی ایسا مخاطب صحیح اور پارسی داں نہیں ہے جو معترض کی کسوٹی کو جانچ سکے"۔[3] (فارسی سے ترجمہ)

غالبؔ نے اپنے دوستوں اور مربیوں کے نام کئی فارسی اور اُردو خطوط میں اس ادبی معرکے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے کئی بیانات ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں جس کی بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ غالبؔ ذہنی اعتبار سے بہت پریشان تھے۔ ان کا خیال

---

[1] اعتراضات بقول غالب دوسرے مشاعرے کے ایک ہفتے بعد کسی نے کیے تھے لیکن یہاں غالبؔ کا بیان مختلف نظر آتا ہے (مثنوی باد مخالف)

[2] پنج آہنگ ۳۴۶، ۳۴۷۔ [3] نامہ ہائے فارسی' ۱۰۷۔

تھا کہ ان واقعات کا اُن کے پنشن کے مقدمے پر بُرا اثر پڑے گا۔

اس وقت کے کلکتے کے تمام شاعروں کے مقابلے میں ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ غالب کی سگی بہن کے شوہر کے بھائی مرزا افضل بیگ کا سماجی رتبہ یقیناً بہت بلند تھا۔ وہ اکبر شاہ ثانی کے وکیل تھے۔ لیکن شعر و ادب میں مرزا افضل کا غالب سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ ان حالات نے غالب کی انا کی لے کو بہت تیز کر دیا تھا۔ اس لیے غالب نے اپنے بعض مربیوں اور دوستوں کے نام خطوط میں اس معرکے کے سلسلے کے جو واقعات بیان کئے ہیں ان میں کہیں غالب سے سہو ہوا ہے اور کہیں اپنی انا کی وجہ سے حقیقت سے رو گردانی کی ہے دوسرے مشاعرے کے ذکر میں غالب نے محمد علی خاں کے نام خط لکھا ہے کہ :-

"اچانک ایک مرد گراں مایہ جو 'ہرات کا سفیر بن کر یہاں آیا ہے' اس انجمن میں شریک ہوا۔ میرے شعر سن کر اس نے بہت اچھے الفاظ میں میری تعریف کی اور اس شہر کے نادرہ گو شاعروں کا کلام سن کر زیرِ لب تبسم فرمایا۔ چوں کہ طبیعتیں بالذات خود نمائی پر مائل رہتی ہیں، اس لیے انجمن کے سرآوردہ حضرات اور فرزانگانِ فن نے میرے دو شعروں پر غلط اعتراضات کئے اور اب ان اعتراضات کو شہرت دے رہے ہیں"[1] (فارسی سے ترجمہ)

غالب نے کلکتے کے مولوی سراج الدین احمد کے نام خطوط میں اس معرکے کا دو تین بار ذکر کیا ہے۔ لیکن کسی بھی خط میں "سفیر ہرات" کا ذکر نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سراج الدین احمد نہ صرف اس ادبی معرکے کے دوران کلکتے میں تھے، بلکہ اس معرکے سے ان کا براہِ راست تعلق تھا۔ غالب نے "سفیر ہرات" کا ذکر صرف نواب محمد علی خاں کے نام خطوط میں کیا ہے، جو اس وقت باندہ میں تھے اور جن کے پاس سفیر ہرات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ غالب نے نواب محمد علی خاں کے نام مختلف خطوط میں سفیر ہرات کے جو بیانات نقل کئے ہیں، وہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

---

[1] بنام محمد علی خاں

غالبؔ نے سفیر ہرات کا ذکر اس انداز میں کیا ہے، جیسے وہ فارسی کا بہت بڑا عالم تھا دراصل کفایت کی حیثیت وہی ہے، جو غالبؔ کے مفروضہ استاد عبدالصمد کی ہے۔ غالبؔ ان دونوں کو فارسی کا زبردست عالم ثابت کرتے ہیں۔ جب کہ کفایت خاں کلکتے میں موجود تھے۔ لیکن مشاعرے میں شریک نہیں تھے۔ یہ دونوں شخصیتیں غالبؔ کی ذہنی اختراع ہیں حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ غالبؔ نے عبدالصمد کی تخلیق اس لیے کی تھی کہ وہ اپنے مخالفین کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ انھوں نے فارسی ایک ایرانی عالم سے سیکھی تھی عبدالرزاق شاکرؔ کے نام یکم اپریل ۱۸۶۶ء کے ایک خط میں غالبؔ نے لکھا ہے :-

"قضارا اس زمانے میں شاہزادہ کامران درانی کا سفیر گورنمنٹ میں آیا تھا۔ کفایت خاں اُس کا نام تھا۔ اُس تک یہ قضیہ پہنچا۔ اس نے اساتذہ کے اشعار پانچ سات ایسے پڑھے، جن میں " ہمہ عالم " و " ہمہ روزو" ہمہ جا" مرقوم تھا اور وہ اشعار قاطع برہان میں مندرج ہیں"۔[۱]

غالبؔ کے اس خط سے پتا چلتا ہے کہ سفیر ہرات اور بقول غالبؔ کفایت خاں مشاعرے میں موجود نہیں تھے۔ اس ادبی معرکے کی تفصیلات سفیر ہرات کو کسی اور نے کہیں سنائی تھیں۔

غالبؔ کی قتیلؔ دشمنی

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مرزا افضل بیگ نے مشہور کر دیا تھا کہ غالبؔ، قتیلؔ کو برا بھلا کہتے ہیں اور کلکتے کے سخن وروں کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتے، جس کی وجہ سے کلکتے کے لوگ غالبؔ کے مخالف ہو گئے۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ جن تین مشاعروں کا ذکر کیا گیا ہے، اُن میں سے کسی مشاعرے میں غالبؔ نے قتیلؔ کو ناسزا نہیں کہا۔ لیکن اس کا پورا امکان ہے کہ کسی نجی محفل میں غالبؔ

---

[۱] غالبؔ کے خطوط، ۴۸۰ - ۴۸۱

نے قتیل کے ادبی مرتبے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہو اور اُن پر منفی تنقید کی ہو۔
اس معرکے میں قتیل کا نام دو بار آیا ہے۔ ایک دفعہ غالب نے محمد علی خاں کے نام خط میں لکھا ہے کہ :۔

"مرزا افضل بیگ نے شاعروں میں مشہور کر دیا کہ اسداللہ خاں غالب قتیل کو برا بھلا کہتا ہے اور کلکتے کے شاعروں کو وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتا"۔[1]

پہلے مشاعرے میں غالب نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طرحی غزلیں پڑھی تھیں۔ غالب نے فارسی میں ایک خط لکھا ہے جس میں اس مشاعرے کے حوالے سے قتیل کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"منصف مزاج لوگوں میں سے کسی نے میرا کلام سن کر کہا کہ جس شخص کے کلام کی فصاحت و بلاغت کا یہ معیار ہو، اس کے سامنے قتیل کی کیا حیثیت ہے بلکہ بات ہمارے دور کے پہلے شاعروں تک پہنچتی ہے۔ ان میں اگر اسیر، بیدل اور اُن جیسے شاعروں سے غالب ہم سری کا دعویٰ کرے تو کیا غلط ہے، بلکہ غالب کو زیب دیتا ہے۔"[2]

ان دونوں اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ غالب نے خطوں میں دو بار قتیل کا ذکر کیا ہے لیکن کسی مشاعرے میں قتیل کا نام تک نہیں لیا۔
ہاں تیسرے مشاعرے میں کسی نے "ہمہ عالم" کی ترکیب کو غلط بتاتے ہوئے قتیل کو بطور سند پیش کیا۔ پھر بھی اُس مشاعرے میں غالب نے قتیل کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ جب مشاعرے میں سند کے طور پر قتیل کا قول پیش کیا گیا تو بقول مولانا الطاف حسین حالی:

"انھوں نے (غالب نے) قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ میں دلوالی سنگھ (دیوانی سنگھ) فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہلِ زبان کے سوا کسی کے قول کو قابلِ استناد نہیں سمجھتا۔"[3]

---

[1] نامہ ہائے غالب۔ ص ۴۰، [2] نامہ ہائے فارسی، ص ۴۰۔ [3] الطاف حسین حالی، یادگار غالب نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۲۱۔

غالب نے کلکتے سے محمد علی خاں اور سراج الدین احمد کے وغیرہ کے نام خطوط میں اس ادبی معرکے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک خط میں بھی وہ فقرہ نہیں لکھا جو اوپر نقل کیا گیا ہے۔ ہاں ۱۸۵۹ء میں (تیس اکتیس سال بعد) غالب نے خواجہ عبدالغفور سرور کے نام خط میں لکھا ہے۔

"نظامی اب ایسا ہوا کہ جب تک فرید آباد کا کھتری دلوالی سنگھ ثم تخلص بہ قتیل، جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے۔۔۔۔۔۔ الخ" [۱]

مولانا حالی نے یہ فقرہ غالب کے خطوط سے لے کر مولوی محمد حسین آزاد کی طرح ایک دلچسپ واقعہ بنا دیا ہے۔

اس ادبی معرکے کے تقریباً دس سال بعد تک غالب خاموش رہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ غالب، قتیل کے مداحوں اور شاگردوں سے خائف تھے۔ جب قتیل کا زور کچھ کم ہوگیا تو غالب نے دل کی بھڑاس نکالنی شروع کی۔ ۱۸۵۳ء تک ان کا لب ولہجہ مہذب رہا، لیکن جب غالب کے خیال سے حامیانِ قتیل مر کھپ گئے تو ان کا لہجہ ترش ہوگیا، بلکہ وہ قتیل کو گالیاں دینے پر اتر آئے۔

غالب کا پہلا خط جس میں غیاث الدین اور قتیل کا ذکر غیر شائستہ انداز میں کیا گیا ہے غالباً نواب سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام ہے، جو آگے نقل کیا گیا ہے۔ اس ادبی معرکے کے بعد غالب کی دستیاب فارسی اور اردو تحریریں، جو میری نظر سے گزری ہیں، کے مطابق غالب نے پہلی بار شیخ امام بخش ناسخ کے نام ایک خط میں قتیل کا ذکر کیا تھا۔[۲] ناسخ کا انتقال ۱۶ اگست ۱۸۳۸ء کو ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خط ۱۸۳۸ء سے قبل کا ہے۔ گویا ادبی معرکے کے دس سال بعد غالب کو قتیل کا خیال آیا۔ اس خط میں غالب نے قتیل کا ذکر غیر مہذب انداز میں نہیں کیا۔

شیخ ناسخ نے غالب کو مشورہ دیا کہ وہ اگر حیدر آباد میں مہاراجہ چندو لال کے پاس چلے جائیں تو ان کی مالی دشواریاں دور ہو جائیں گی۔ غالب کو معلوم ہو چکا تھا کہ مہاراجہ چندو لال فارسی میں قتیل اور اردو میں شاہ نصیر کے مدّاح ہیں۔ اس لئے قدرے تلخ لہجے

---

[۱] غالب کے خطوط۔ ۲۔ ۵۸۷۔ [۲] ممکن ہے اس سے قبل بھی غالب نے قتیل کا ذکر کیا ہو، مگر غالب کی وہ تحریر میری نظر سے نہیں گزری۔

میں ناسخ کو جواب دیتے ہیں۔

"چندولال میرے زمزموں (شاعری) سے کیا واقف اور میرے طرز اور روش کو کیا جانتے ہیں، جو فارسی میں قتیل کو اُستاد سمجھتے ہوں، وہ غالب کو کیا سمجھیں اور جو اُردو میں نصیر (شاہ نصیر) کے مدّاح ہوں۔ ان کی نظر میں ناسخ کیا ہیں۔ اس وقت ان کی عمر اسّی سال سے زائد ہے۔ میں جب تک ان کے پاس پہنچوں وہ جہنم رسید ہو چکے ہوں گے۔"[1] (فارسی سے ترجمہ)

مئی ۱۸۴۷ء کے ایک خط میں غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھا ہے۔

"ظاہراً تم غور نہیں کرتے اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیش تر اس نظم و نثر کو مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں، جو لوگ قتیل کو اچھے لکھنے میں جانیں گے، وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا کیا پہچانیں گے۔"[2] (فارسی سے ترجمہ)

غالب نے حکیم احسن اللہ کو ایک فارسی خط میں قتیل کے بارے میں لکھا ہے۔

"اس دعوے گاہ میں انصاف کیسے ہوسکتا ہے، جہاں قتیل کی زباں دانی کو مسلم سمجھا جائے اور نور العین واقف کی زباں دانی کو شیوہ بیانی کے جھنڈے پر چڑھایا جائے۔ وہاں کس سے دریافت کروں کہ میرے نتائج طبع کیا ہیں اور اس جگر سوزی میں مجھے کیا لطف ملا ہے۔"[3] (فارسی سے ترجمہ)

یہ خط "پنج آہنگ" میں شامل ہے۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۸۴۹ء میں مطبع سلطانی دہلی سے اور دوسرا ۱۸۵۳ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ میرے پیش نظر ۱۸۵۳ء کا نسخہ ہے۔ اگر حکیم احسن اللہ خاں کے نام یہ خط پہلے اڈیشن میں بھی شامل ہے تو بیس پچیس سال بعد ۱۸۴۹ء میں ورنہ ۱۸۵۳ء میں غالب نے قتیل کا ذکر کیا ہے۔ لیکن غالب کا لب و لہجہ خاصا شائستہ ہے۔ اس کے بعد مختلف اُردو خطوط میں غالب نے قتیل کو برا بھلا کہا۔

---

[1] متفرقاتِ غالب، مسعود حسین رضوی ادیب (مرتب)، لکھنؤ، سنہ اشاعت ندارد، ص ۱۳۰

[2] غالب کے خطوط، ۲، ۲۲۷، ۲۲۸۔ [3] غالب پنج آہنگ، دہلی ۱۸۵۳ء، ص ۲۴۴

قتیل دشمنی میں غالب نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں، جو اُن جیسے عظیم شاعر کو کسی طرح زیب نہیں دیتیں۔ اسلام کی عظمت یہ ہے کہ جب کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرلیتا ہے، تو اسے وہ حقوق مل جاتے ہیں، جو تمام مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ پھر کسی نومسلم کو اس کا ماضی یاد دلاکر ذلیل کرنا، بُرا بھلا کہنا اسلام کے بنیادی اصولوں کے صریحاً خلاف ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عملی زندگی میں غالب انتہا درجے کے سیکولر انسان تھے، خاصی تعداد میں ان کے غیر مسلم شاگرد تھے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کو اپنا بیٹا کہتے تھے۔ قتیل کے ساتھ ان کا رویہ مضحکہ خیز اور متعصبانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غالب کا عقیدہ نہیں بلکہ قتیل دشمنی ہے۔

غالب نے صاحب عالم کے نام خط میں قتیل کو لکھا ہے۔

"اسی طرح کی نثریں جو لالہ دلوالی سنگھ قتیل متوفی نے بہ تقلید اہل ایران لکھی ہیں۔" [۱]

قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کو لکھتے ہیں۔

"یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے۔" [۲]

چودھری عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں۔

"جب تک فرید آباد کا کھتری دلوالی سنگھ ثم متخلص بہ قتیل، جس کو حضرت نے مرحوم لکھا ہے۔" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [۳]

اسی خط میں غالب نے قتیل کو غیر مسلم ثابت کرنے کے لئے "متوفی" لکھا ہے۔ اسی ایک خط میں غالب نے صاحب عالم کو لکھا ہے۔

"عقل کو کام فرماؤ، غور کرو، سمجھو، عبدالواسع پیغمبر نہ تھا، قتیل برہما نہ تھا، واقف غوث الاعظم نہ تھا۔" [۴]

مثنوی بادِ مخالف

غالب کے ایک مربی علی اکبر خاں سے کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ غالب ہم لوگوں

---

[۱] غالب کے خطوط، ۲، ۵۸۷۔ [۲] غالب کے خطوط، ۴، ۱۴۹۷۔

[۳] غالب کے خطوط، ۲، ۵۸۷۔ [۴] غالب کے خطوط، ۳، ۵۸۷

کو سخت سست کہتے ہیں اور ہم پر سخت الفاظ میں تنقید کرتے ہیں۔ غالبؔ نے علی اکبر خاں سے پوچھا کہ ان حالات پر قابو پانے کے لئے کیا کروں۔ انھوں نے جواب دیا کہ معذرت کرو، کیوں کہ اس معرکے کا اثر تمہارے اصل مقصد یعنی پنشن کے مقدمے پر بہت بُرا پڑے گا۔ غالبؔ نے یہ مشورہ قبول کر کے "آشتی نامہ" کے نام سے ایک مثنوی لکھی (کلکتہ سے آنے کے بعد اس مثنوی کا نام بدل کر "بادِ مخالف" رکھ دیا۔ مثنوی سے اندازہ ہوتا ہے کہ کلکتے کے ہندوستانی صاحبِ اقتدار طبقے میں، قتیلؔ کے مداحوں، شاگردوں اور حامیوں کی بہت بڑی تعداد تھی اور دیکھئے اس مثنوی کے ایک شعر میں غالبؔ نے اپنی بے کسی، مجبوری اور پریشانی کا ذکر کیسے دردناک انداز میں کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ خدا گواہ ہے کہ مجھ میں ہنگامہ آرائیوں کی تاب نہیں ہے۔ اے مہربانو! میرا دل پتھر تو نہیں ہے۔

تابِ ہنگامہ ام، خدا را نیست

مہرباناں دلست، خارا نیست

غالبؔ کو احساس تھا کہ وہ حالات کے شکنجے میں پھنس گئے ہیں۔ ان کی مجبوری پنشن کا مقدمہ ہے اور مخالف اس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ورنہ علم و فضل اور فن شاعری میں کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اپنے کرم فرما علی اکبر خاں کے مشورے پر انھوں نے یہ مثنوی تو لکھنی شروع کر دی اور اس میں معذرت خواہی کا انداز بھی اختیار کیا۔ لیکن مثنوی کے آخر میں ان کی انا، خود داری اور برتری کا احساس پھر جاگ اُٹھا۔ کہتے ہیں کہ میرے متعلق مشاعروں کی محفل میں لوگوں کے زبان پر یہ چڑھ گیا ہے کہ قتیلؔ کے متعلق غالبؔ کی رائے اچھی نہیں ہے اور وہ اس کے خوانِ نعمت کی مکھی نہیں بنتا۔ یہ غالبؔ کی انا ہی ہے جو ان سے کہلواتی ہے کہ مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں کسی کے دسترخوان کے زلہ بردار بنوں۔ میں خود "ہما" ہوں۔ مکھی کیسے بن سکتا ہوں۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ میں نے قتیلؔ کی صحبت سے استفادہ نہیں کیا۔ مجھے اس کی شہرت پر رشک بھی نہیں۔ ہم دونوں ہم فن ضرور ہیں، لیکن نہ ہم ایک دوسرے کے دوست ہیں اور نہ دشمن۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ جن لوگوں کو فارسی پر قدرت حاصل ہے۔ ان کی رائے ہے کہ قتیلؔ اہل زبان نہیں تھا اور اصفہان کا

رہنے والا نہیں تھا، اس لیے اس کی فارسی دانی پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور وہ کچھ کہے۔ اسے سند نہیں مانا جا سکتا۔ فارسی تو اہلِ ایران کی زبان ہے۔ ان کے لئے آسان اور ہمارے لیے مشکل ہے۔ یہ ڈھکی چھپی نہیں بلکہ کھلی بات ہے کہ دہلی اور لکھنؤ ایران کے شہر نہیں۔ ہم سب قتیلؔ کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اور ہم نے اس کو اپنا رہبر بنا لیا ہے۔ اس کے بعد کئی اشعار میں غالبؔ نے بتایا ہے کہ وہ علی حزیںؔ، جلال اسیرؔ، طالبؔ، عرفیؔ، نظیریؔ، اور ظہوری کے معنی، مضمون اور زبان کے دل سے اس لئے قائل ہیں کہ یہ سب اہلِ زبان ہیں۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ میں ان سب اہلِ زبان کی شاعری کا عاشق و دلدادہ ہوں جس شخص نے ان سب کی شاعری کو حرزِ جان بنایا ہو، وہ قتیلؔ کو کیسے نظر میں لا سکتا ہے قتیلؔ کے بارے میں دل کی بھڑاس نکال کر غالبؔ کہتے ہیں کہ جس شخص نے یہ منزلیں طے کی ہوں، اس کی نظر میں قتیلؔ اور واقفؔ کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے۔ پھر غالبؔ معذرت پر اُتر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سرمایے کے باوجود جو میرے پاس ہے اور جو گنجِ معانی اپنے آستین میں رکھتا ہوں۔ میں دوستوں پر دل و جان قربان کرتا ہوں اور اپنے شوق کو احباب کی مرضی پر صرف کئے دیتا ہوں۔ میں صلحِ صفائی پر آمادہ ہوں اور قتیلؔ کی تعریف کرتا ہوں، تاکہ مجھ سے کسی کو شکایت باقی نہ رہے اور قتیلؔ کے ماننے والوں سے مجھے انعام ملے۔ دراصل اس منزل میں غالبؔ عجب پس و پیش میں ہیں۔ کبھی قتیلؔ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اہلِ زبان نہیں ہے۔ کبھی اس کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی معذرت کا لہجہ اختیار کر لیتے ہیں قتیلؔ کی زباں دانی سے انکار کے بعد پھر غالبؔ، قتیلؔ کی مدح سرائی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اگرچہ میں قتیلؔ کو ایرانی نہیں کہوں گا اور نہ ہی اسے دوسرا سعدی کہوں گا، لیکن قتیلؔ مجھ سے اور مجھ جیسے بے شمار لوگوں سے ہزار درجے بہتر ہے۔ میں تو ایک مشتِ خاک ہوں اور قتیلؔ بلند آسمان۔ مٹی آسمان پر کیسے کمند ڈال سکتی ہے۔ غالبؔ، قتیلؔ کی مدح سرائی میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قتیلؔ کی تعریف کرنا میرے بس کی باہر ہے۔ سورج ایک سوراخ میں نہیں آ سکتا۔ قتیلؔ کا سازِ خوش بیانی، مرحبا!

اور اس کی نکتہ دانی کی شہرت واہ واہ ! اس کی نظم آب حیات ہے ، جو روانی میں دریائے فرات کی طرح ہیں۔ اس کی اثر میں مور کے پروں کی طرح مختلف خوشنما رنگ ہیں ، جس میں صراح و قاموس جیسی لغتوں کے منتخب الفاظ موجود ہیں۔ ملکِ سخن کے اس بادشاہ نے کیسے کیسے عجب نکتے ایجاد کئے ہیں. اس کا قلم فارسی داں ہندی ہے اور ہندوستانیوں نے اس کے آگے سر جھکا لیا ہے۔ غالبؔ اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میں ایک ناپختہ اور ہیچ مداں انساں ہوں۔ دوستوں کی خدمت میں معذرت نامہ پیش کر رہا ہوں۔ میری عذر خواہی اور بے گناہی پر، مجھے امید ہے کہ آپ کو رحم آئے گا۔ دوستی کے پیغام پر مشتمل یہ صلح نامہ ختم ہوا۔ والسلام والاکرام۔

قتیلؔ سے غالبؔ کی ادبی جنگ یک طرفہ تھی، گویا غالبؔ قتیلؔ سے ہوا میں مکّے بازی کرتے رہتے تھے۔ جب کلکتے میں اس جنگ کا آغاز ہوا تو قتیلؔ کے انتقال کو دس سال گزر چکے تھے۔ تقریباً تیس سال تک غالبؔ شاگردوں اور دوستوں وغیرہ کے خطوط میں قتیلؔ کو بُرا بھلا کہتے رہے اور ان پر اعتراض کرتے رہے۔ چوں کہ یہ اعتراضات نجی خطوط میں کئے گئے تھے ، اس لیے قتیلؔ کے حامیوں کو ان کا علم نہیں ہو سکا۔ ورنہ یقیناً بہت بڑا ہنگامہ ہوتا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد غالبؔ نے " قاطع برہان " اور " تیغ تیز " وغیرہ میں قتیلؔ پر اعتراضات کئے۔ لیکن اُس وقت تک فارسی زبان و ادب کی بساط اُلٹ چکی تھی۔ قتیلؔ کے حامیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی اور پھر معترضین کی پوری توجہ اُن اعتراضات پر تھی جو غالبؔ نے محمد حسین تبریزی اور ان کی لغت " برہانِ قاطع " پر کیے تھے۔ اگر غالب کے کسی شاگرد سے کوئی غلطی ہوتی تو وہ اس کی اصلاح کرتے ہوئے بے وجہ قتیلؔ کو بھی بُرا بھلا کہہ دیا کرتے تھے۔

قتیلؔ دشمنی میں غالبؔ کا یہ حال تھا کہ ہمیشہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ قتیلؔ کی غلطیاں نکال کر انھیں برا بھلا کہہ دیا کرتے تھے۔ دو چار دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی اور پر اعتراض کرتے ہوئے یا کسی کی غلطی کی نشان دہی کرتے ہوئے غالبؔ قتیلؔ کا ذکر اس انداز سے کرتے ۔ " یہ فارسی لالہ قتیلؔ کی ہے۔" " قتیلؔ کی پیروی ہے " یا " ایسی غلط بات

قتیلؔ ہی کہہ سکتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

غالب اپنے ایک شاگرد قاضی عبدالجمیل بریلوی کے نام ۸ ستمبر ۱۸۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"غیاث الدین رام پور میں ایک ملائے مکتبی تھا۔ ناقلِ عاقل جس کا ماخذ اور مستند علیہ قتیلؔ کا کلام ہوگا۔ اس کا فنِ لغت میں کیا فرجام ہوگا۔

کیستم من کہ تا ابد بزیم

لاحول ولا قوۃ یہ مصرع میرا نہیں۔ تا ابد بزیم یہ فارسی لالہ قتیلؔ کی ہے[۱]

ایسا ہی ایک معاملہ آغا احمد علی کے ساتھ ہوا۔

غالبؔ نے موید برہان کے جواب میں "تیغ تیز" لکھی تھی، جس میں غالبؔ کہتے ہیں۔

"مولوی جی (آغا احمد علی احمد) نے قتیلؔ کی پیروی کی ہے کہ وہ غلط غلط محاورے لکھ کر اس کی تصحیح کرتا ہے، مثلاً 'نان از مربائے سیب خوردم' کو غلط کہتا اور ہدایت کرتا ہے کہ "نان با مربائے سیب خوردم" کہو"[۲]

بقول قاضی عبدالودود:۔

"صاحبِ موید کا جواب یہ ہے کہ "نان از مربائے سیب خوردم"..... فرضی نیست' چنانچہ عبدالرحیم دہری در فرہنگ دبستاں ایں غلط عوام رانشاں دادہ وگفتہ کہ ناداناں ترجمہ ہندی زباں می کنند" (شمشیر تیز تر ص ۳۴) ایسے جھوٹ سے قتیلؔ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا، اعتراض نادرست ہے"[۳]

مطلب یہ کہ "نان از مربائے سیب" کے غلط یا صحیح ہونے سے قتیلؔ کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۱، غالبؔ نے قتیلؔ پر غلط اعتراض کئے ہیں۔ غالبؔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں ایسا ہی ایک اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"قتیلؔ کو اساتذۂ سلف کے کلام سے قطعاً آشنائی نہیں"[۴]

---

[۱] غالبؔ کے خطوط، ۴، ۱۴۹۷۔ [۲] تیغ تیز، ص ۹۔ [۳] جہانِ غالب، ص ۴۶۔
[۴] غالبؔ کے خطوط، ۲، ۵۸۷۔

قتیلؔ پر غالبؔ کا یہ اعتراض بالکل بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہے۔ جن حضرات نے قتیلؔ کی "چار شربت"، "نہر الفصاحت" اور "رقعاتِ قتیلؔ" کا مطالعہ کیا ہے، انھیں اندازہ ہوگا کہ غالبؔ کا اعتراض محض قتیلؔ دشمنی کی وجہ سے ہے ورنہ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قتیلؔ فارسی زبان وادب کے اپنے عہد کے ممتاز عالموں میں تھے۔

(۲) غالبؔ نے قتیلؔ پر اعتراض کیا تھا کہ وہ اساتذہ سلف کے کلام سے قطعاً ناآشنا ہے: غالبؔ نے ایسا ہی ایک اور مضحکہ خیز اعتراض کیا ہے۔ وہ چودھری عبد الغفور سرور کو لکھتے ہیں۔

"اس کے (قتیلؔ) کے فارسی کا مآخذ ان لوگوں کی تقریر ہے کہ جو نواب سعادت علی خاں کے وقت میں ممالکِ غربی کی طرف سے لکھنؤ میں آئے اور ہنگامہ آرا ہوئے۔ بیشتر ان میں سادو اکذا، کشمیری یا کابلی و قندھاری و کرانی۔ احیاناً گوئی عامۂ اہلِ ایران سے بھی ہو۔ مانا کہ عظمائے ایران میں سے بھی کوئی ہوگا۔ تقریر اور ہے تحریر اور ہے۔ اگر تقریر بعینہٖ تحریر میں آیا کرے تو خواجہ وطاط اور شرف الدین علی یزدی اور حسین واعظ کاشفی اور طاہر وحید یہ سب نثر میں کیوں خونِ جگر کھایا کرتے۔ اسی طرح کی نثریں جو لالہ دلوالی سنگھ قتیلؔ متوفی نے بہ تقلید اہلِ ایران لکھی ہیں کیوں نہ رقم فرمایا کرتے" [1]

غالبؔ کے اس اعتراض کا جواب خود غالبؔ کے ایک خط سے دیا جاتا ہے۔ جو انھوں نے چودھری عبد الغفور سرور کو لکھا تھا۔

جلالائے طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ نے شیدائے ہندی کو ایک رقعہ لکھا ہے۔ عبارت اس وقت یاد نہیں آتی۔ مگر یہ مضمون اس کا ہے کہ ایک دن مولانائے عرفی علیہ الرحمۃ اور ابوالفضل میں مباحثہ ہوا۔ شیخ نے عرفی سے کہا کہ "ہم نے تحقیق کو بہ سرحدِ افراط پہنچا دیا اور فارسی میں خوب کمال پیدا کیا۔" عرفی نے کہا کہ "اس کو کیا کروگے کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا، اپنے گھر کی بڑھیوں سے اور لونڈھیوں سے جو بات سنی، فارسی میں سنی۔ شیخ گفت، ما فارسی را

---

[1] غالبؔ کے خطوط: ۲: ۵۸۷،

از انوری و خاقانی فرا گرفتہ ایم و شما از پیر زناں آموختہ باشند' ختم " لہ

گویا انسان اہلِ زبان ہی سے زبان سیکھتا ہے ۔ اب اگر قتیل نے ایرانیوں کی تقریر سے زبان سیکھی تو کیا غلط کیا ۔

(۳) غالب کے شاگرد سید غلام حسین قدر بلگرامی نے " حسبِ لیاقت خودم " لکھ دیا ۔ غالب کو خودم پر اعتراض ہے ۔ قدر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

" حسبِ لیاقتِ خود " کافی است ۔ " خودم " چہ محل دارد ؟ مگر ہماں شیوۂ قتیل ۔ بندہ مجبورم ، ہماں سکہ قتیل " ۲ے

غالب کا یہ اعتراض ہے ۔ خود غالب نے " قاطع برہان " میں لکھا ہے ۔

" بر پروانِ خودم دل سوخت " ۳ے

قاضی عبدالودود نے غالب کے اس اعتراض کو غلط بتایا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں (بیست مقالہ قزوینی جلد ا ص ۸۱) کا یہ فقرہ نقل کیا ہے ۔

" تکلیف وجدانی خود با نہایت قلت بضاعت بجز وضعیف خودم " ۴ے

(۴) دیوانِ قتیل اور " ثمرات البدائع " میں قتیل کا ایک شعر ہے ۔

یک وجب جائے بہ کوئے تو زخوں پاک نبود
کشتہ برکشتہ تپاں بود دگر خاک نبود

غالب قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

" اہلِ ہند کی فارسی اسی طرح خام اور ناتمام رہی کہ اصول میں انھوں نے فارسی کے قواعد کی تطبیق عربی سے چاہی اور اُردو کے خاص روز مرے کی فارسی بنا لیے ۔ ہندی میں " کچھ نہیں " کی جگہ " خاک نہیں " بولتے ہیں ۔ فارسی میں " ہیچ نیست " کی جگہ " خاک نیست " کبھی کوئی نہ کہے گا ۔ قتیل چاروں خانے چت گرا ہے ۔

لہ غالب کے خطوط : ۲ : ۵۹۴ ۔ ۲ے غالب کے خطوط : ۴ : ۱۴۱۷ ۔ ۳ے قاطعِ برہان ص ۱۲۷ ۔ ۴ے قاضی عبدالودود ، جہانِ غالب ' پٹنہ ' ۱۹۹۵ء ص ۴۶ ۔

کشتہ بر کشتہ تپاں بود، دگر خاک نبود

یعنی ہیچ نہ بود ۔ لاحول ولا قوۃ ۔ [1]

اس شعر پر غالب کا اعتراض اس لیے غلط ہے کہ اس محاورے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے قتیل نے لکھا ہے ۔

ایں محاورہ را ہمیشہ ہندی میدانستم " [2]

یہاں ایک مصرع یاد آرہا ہے ۔

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

غالب نے ایک فارسی شعر میں اردو محاورے "میری گرہ سے کیا گیا" کو اس طرح استعمال کیا ہے ۔

گوئی مباد طرّہ خوں شد
دل زانِ تست از گرہ ما چہ می رود

غالب نے لفظ "بے پیر" سے بحث کرتے ہوئے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے ۔

" لفظ بے پیر بچہ تورانی بچہ ہائے ہند نژاد کا تراشا ہوا ہے ، جب میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو شعر فارسی میں کیوں کر اجازت دوں گا ۔

مرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے ۔ میری کیا مجال ہے کہ ان کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں ، لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادہ ایران ایسا لکھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لفظ " بے پیر " ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحبِ زباں ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں " [3]

غالب کے معیار دو ہیں ۔ اگر اسیر لفظ "بے پیر" استعمال کرے تو غالب تعجب کر کے رہ جاتے ہیں اور اگر قتیل ایسا کرے تو بقول ان کے " چاروں خانوں چت گرا ہے "۔

---

[1] غالب کے خطوط : ۴ : ۱۴۲۸ ۔ [2] ثمرات البدائع : ص ۲۳۲ ۔ [3] غالب کے خطوط : ۱ : ۲۳۴

"کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک صاحب قتیلؔ کے شاگرد تھے۔ میں نے ایک رقعہ قتیلؔ کا ان کے نام کا دیکھا ہے کہ قتیل ان کو لکھتا ہے کہ "جامہ گذاشتن" بہ معنی مردن "مسلّم ہے۔ لیکن بہت احتیاط کیا کرو، موقع دیکھ لیا کرو، جب لکھا کرو۔ میں کہتا ہوں کہ احتیاط کیا اور موقع کیا؟" [1]

قتیلؔ نے خواجہ امامی کے نام خط میں "جامہ گذاشتن" کے بارے میں لکھا تھا:-

"...... دیگر اینکہ در خط شما لفظ جامہ گذاشتن" در حق شخصے بود۔ آیندہ مذکورِ او ہیچ نہ باید نوشت۔ خبرہائے اراجیف از زبانِ عوام معتبر نیست۔ اگر چیزے دلالت بر عظمت وجبروت او داشتہ باشد مضائقہ ندارد۔ والا چہ ضرور خصوصاً عبارتے کہ در و لفظ "جامہ گذاشتن" ومثل آن باشد ہیچ صورت مناسب نیست۔ ہرچند ایں اصطلاح راکم کسے می داند۔ لیکن بقرینہ دریافت می تواند شد۔ آیندہ اگر ہمچو چیزے بگوش خورد، بہتر انیست کہ نویسید۔

چراکہ اگر اصلے دارد بعد دوروز شما ہم خواہید شنید واگر دروغ است نوشتن آن خالی از قباحت نیست وایں ہمہ آفت ہا در تصریح نام شخص است اگر بکنایہ باشد ہیچ قباحتے نہ دارد ...... یا تمام عبارت در ترکی نوشتن بہتر است کہ احدے برآں مطلع نمی شود۔" [2]

قتیلؔ کے خط کے اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے انھوں نے "جامہ گذاشتن" کے استعمال کے بارے میں ہدایت نہیں دی ہے بلکہ مکتوب الیہ کو لکھا ہے کہ تم نے فلاں شخص کی وفات کی افواہ سن کر مجھے اس کی اطلاع دی ہے۔ اگرچہ تم نے "جامہ گذاشتن" کا محاورہ استعمال کیا ہے، لیکن سمجھنے والے تو تمہارا اصل مطلب سمجھ جائیں گے۔ اس لیے آیندہ اس طرح کی بات خط میں نہ لکھا کرو اور اگر لکھو تو بہتر ہے کہ ترکی میں لکھو، تاکہ کوئی سمجھ نہ سکے۔

قتیلؔ کے خط سے معلوم ہوتا ہے اودھ کے کسی بڑے آدمی کے مرنے کی افواہ سن کر امامی نے خط لکھا تھا۔ بڑا آدمی کون ہے؟ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ یہ نواب سعادت علیخاں

---

[1] غالبؔ کے خطوط: ۲: ص ۵۹۴۔ [2] بحوالہ سید اسد علی انوری فرید آبادی، قتیل اور غالب، دہلی، ۱۹۲۹ء ص ۸۵۔ ۸۶۔

کا ذکر معلوم ہوتا ہے۔ میرے لیے اس سلسلے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ بہر حال، جامہ گذاشتن" کے بارے میں غالب کا خط پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اس خط کے سلسلے میں دو سہو ہوئے۔ ایک تو غالب نے لکھا ہے کہ یہ خط " کالپی کے نواب زادوں میں سے ایک" کے نام ہے۔ یہ درست نہیں ہے خط خواجہ امامی کے نام ہے۔ غالب نے لکھا ہے کہ قتیل نے ہدایت دی ہے کہ" جامہ گذاشتن کے بارے میں بہت احتیاط کیا کرو، موقع دیکھ لیا کرو، جب لکھا کرو"۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ قتیل کہنا چاہتے ہیں کہ بڑے آدمی کی وفات کے بارے میں اگر کوئی افواہ سنو تو خط میں نہ لکھو، کیوں کہ اگر کسی اور نے خط پڑھ لیا، تو مصیبت آجائے گی۔

(۶) قدر بلگرامی کے نام خط میں قتیل پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"تاہم دوسہ جائی علی التواتر زدہ بودم" مازدہ بودم" تمہارا دل اس ترکیب کو کو قبول کرتا ہے؟ "من زدہ بودم" یا "مازدہ بودیم" اس کے علاوہ "دوسہ جامگی" بہ کاف فارسی، یعنی چہ؟" جام" معلوم، کاف تصغیر کا" جامک" چاہیے۔" جامگ" کیا؟ مگر یہ پیروی قتیل کی ہے کہ وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر اپنی بنانا چاہتا ہے۔ ظہوری، جلال، ظہیر، طاہر وحید کسی نے جام کو جامگ نہیں لکھا۔ دو سے جائی کی جگہ دوسہ ساغر یا دوسہ قدح لکھو۔"[۱]

قتیل دشمنی میں غالب بعض غلط باتیں قتیل سے منسوب کرکے انھیں برا بھلا کہتے تھے۔ اس اعتراض کا بھی یہی حال تھا۔

میرا خیال ہے کہ قتیل نے کہیں جام کو" جامک" نہیں لکھا اور پھر فارسی شاعری میں " جامک" کی مثالیں ملتی ہیں۔ بقول قاضی عبدالودود:۔

" جامک ایک مستند ایرانی شاعر۔ طغرا کے یہاں بھی آیا ہے، جامکے در دست مینا در بغل"[۲]

چودھری عبدالغفور سرور کے نام غالب لکھتے ہیں:۔

---

[۱] غالب کے خطوط: ۴: ۱۴۱۶ ۔ ۱۴۱۷
[۲] سید اسد علی انوری، قتیل اور غالب، دہلی، ۱۹۳۹ء ص ۶۸

"یہ شخص (قتیل) مدعی ہے کہ "کدہ" کا لفظ سوائے پانچ چار اسم کے اور اسم کے ساتھ ترکیب نہیں پاتا۔ پس "آرزوکدہ" اور "دیوکدہ" اور "نشترکدہ" اور امثال اس کے جو ہزار جگہ اہلِ زبان کے کلام میں آیا ہے، وہ نادرست ہے۔ میں اور آپ بیٹھیں اور اس کے خرافات پڑھے جائیں اور جو میں عرض کروں، اس پر حضرت غور فرمائیں، تب معلوم ہو کہ یہ کتنا لغو اور فارسی دانی سے کتنا بیگانہ ہے۔" [1]

"کدہ" کے استعمال کے بارے میں غالب نے مرزا تفتہ کو لکھا ہے :-

"سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادی فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھسا گھس، اُلو عبدالواسع ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلو کا پٹھا قتیل "صفوت کدہ و شفقت کدہ" و "نشترکدہ" کو اور "ہمہ عالم" "وہمہ جا" کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زماں" کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ لِلّٰہِ الحَمدُ وَلِلّٰہِ الشُّکرُ ؟" [2]

غالب نے "قاطع برہان" میں "کدہ" کے موضوع پر قتیل کے ایک شاگرد سے گفتگو کی۔ جس کی تفصیل ان الفاظ میں لکھی ہے۔

"یکے از پرورش آموختگان قتیل نومسلم در کلکتہ بمن گفت استاد۔۔۔۔۔ جزا کے چند کہ شمار آں از پنج یا شش نگذرد، ماقبل کدہ آوردن۔۔۔۔۔ جائز نمی شمارد۔ پاسخ گزاردم کہ بجزاں بگفتہ، چوں خودے کار بر خود تنگ گیرند، آگاہ دلاں راچہ افتادہ کہ توقیع ناروا را پذیرند۔ حیرت کدہ و ظلمت کدہ۔۔۔۔ امثال اینہا در نظم و نثر اہل عجم بسیار است" [3]

غالب کے اس اعتراض کے بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :-

---

[1] غالب کے خطوط : ۲ : ۵۸۷۔ [2] غالب کے خطوط : ۱ : ۳۳۶۔
[3] قاطع برہان، ص ۱۳۷، بحوالہ جہانِ غالب، ص ۴۵

"کدہ کا ذکر بادِ مخالف میں نہیں، مگر بقول خود تلمیذ قتیل کو جو جواب انھوں نے دیا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مشاعرے میں قتیل کے قول کی بنا پر اعتراض ہوا ہو گا تو کس قدر بھڑ گئے ہوں گے۔ لفظ زیر بحث کے متعلق قتیل نے "نہر الفصاحت" میں لکھا ہے کہ "کدہ" ۵ لفظوں 'بت، غم، آتش، مے، گلشن' کے ساتھ ملحق ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مسموع نہیں، آبکدہ نہ جانے درست ہے یا غلط۔ ص ۲۵ حاشیے کی عبارت یہ ہے۔ یعنی ایں با اصول اند و سوائے ایں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آنچہ در کلام اساتذہ یافتہ شود فروع ایںہا باشد حصر مقصود نیست و فروع دراصل داخل است" یہ حاشیہ نہ معلوم کس کا لکھا ہوا ہے، اگر قتیل کا ہے تو گویا انھوں نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا ہے۔ اس صورت میں متن میں جو کچھ ہے، وہ لا حاصل ہے۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ قدما کے یہاں صرف مرقومۂ بالا الفاظ کے ساتھ کدہ آیا ہے۔" لے

حکیم ابوالعلاء ناطق لکھنوی نے "کدہ" کی بحث پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:-

غالب نے ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ "یہ اُلّو کا پٹھا قتیل صفوت کدہ و شفقت کدہ، نشتر کدہ، و ہمہ جا" ہمہ عالم کو غلط کہتا ہے۔

۱۔ اس عبارت میں دو اعتراض ہیں، قتیل نے صفوت کدہ اور نشتر کدہ کو غلط بتایا ہے۔

۲۔ ہمہ عالم و ہمہ ہمہ جا کو قتیل نے ناجائز قرار دیا ہے۔

دونوں الزام قتیل پر بہتان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ کیوں کہ نہ تو انھوں نے قتیل نے، کہیں صفوت کدہ اور نشتر کدہ کا نام لیا ہے اور نہ ہمہ و ہمہ جا کو کہیں غلط بتایا ہے۔ ان اعتراضوں کے سلسلے میں قتیل کی یہ عبارت ہے:-

"دیگر کدہ بمعنی خانہ باشد با پنج لفظ ملحق شدہ سوائے آں مسموع نیست بت کدہ و غم کدہ و آتش کدہ و مے کدہ و گلشن کدہ و غیر آں چوں آب کدہ نمی دانم کہ درست است یا نادرست است۔ یعنی ایںہا اصول اند و سوائے ایں فروع فروع (کذا)، دراصل و فروع دراصل داخل است چوں حیرت کدہ

وسنبل کدہ و ویران کدہ و حسرت کدہ و ماتم کدہ و راحت کدہ و تغافل کدہ و جہنم کدہ و بہشت کدہ و ہردو در گلشن کدہ داخل است چراکہ گلشن جائے گل معنی بود و ماتم کدہ و عشرت کدہ و تحتِ غم کدہ داخل اند اول حصر مقصود نیست الخ :

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ پانچ لفظ اصول اور باقی الفاظ جو کدہ کے ساتھ مرکب ہیں، وہ فروع ہیں اور یہ بھی اصل میں داخل ہیں یعنی ان کا استعمال کرنا بھی جائز ہے۔ قتیل نے یہ نہیں لکھا ہے کہ صفوت کدہ اور نشتر کدہ وغیرہ غلط ہیں۔ مگر میں قتیل کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ پانچ لفظ، اصول ہیں۔ سوائے اس کے مسموع نہیں ہے۔ مسموع کے بارے میں حسب ذیل گذارش ہے۔

تسکین کدہ ۔ رضی دانش

جفا کدہ ۔ سراج الدین خاں آرزو :-

کعبہ تسکین کدہ دیر تسلی گاہ ست | نالہ سر کن جا خانۂ رس ست

جفا کدہ ۔ سراج الدین خاں آرزو

دریں جفا کدہ از کس مجوئے رنگِ ثبات | کہ طفل اشک ہم این جا چو نالہ ہرجائیست

پروین کدہ ۔ حکیم زلالی :-

دریں پروین کدہ چنداں بمانم | کہ شعر بر شعرے فشانم

پریشاں کدہ ۔ جلال اسیر :-

در پریشاں کدۂ یاس بود فیض رسا | سایۂ بید خوش آیند شمالے دارد

مجھے اصول و فروع کی تعلیم سے بھی اختلاف ہے۔ غالب نے جو نشتر کدہ صفوت کدہ و شہرت کدہ کے متعلق لکھا ہے کہ قتیل ان الفاظ کو غلط بتاتے ہیں۔ قتیل نے تو کہیں ان الفاظ کا ذکر بھی نہیں کیا، یہ اس غریب پہ تہمت ہے، بلکہ انھوں نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ حصر مقصود نہیں ہے۔ میں نے ساٹھ ستر الفاظ کدہ سے مرکب دیکھے ہیں۔ نہ تو ان میں یہ الفاظ ہیں اور نہ میرا ذاتی ذوق ان الفاظ کو قبول کرتا ہے، جب تک کسی ایرانی کے کلام میں

دیکھ نہ لوں[1]"

کدہ کے سلسلے میں غالب کا اعتراض بالکل بے بنیاد ہے۔ کیوں کہ قاضی عبدالودود نے "نہرالفصاحت" کے حاشیے پر لکھی گئی جو عبارت نقل کی ہے، اس کے مطابق قتیل نے اپنا دعویٰ واپس لے لیا تھا۔ چوں کہ غالب کی نظر سے "نہرالفصاحت" کا وہ قلمی نسخہ نہیں گزرا تھا، جس پر قاضی عبدالودود کا نقل کیا ہوا، حاشیہ لکھا ہوا ہے۔ اس لئے غالب اس اعتراض کے سلسلے میں بے قصور ہیں۔

۸۔ غالب نے نثر کی اقسام پر اپنے کئی خطوط میں گفتگو کی ہے۔ خاص طور سے خواجہ عبدالغفور سرور کے نام خطوط میں یہ بحث مفصل ہے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں تو نہیں لکھا، لیکن ان کے اُردو خطوط کی بعض عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ قتیل نے نثر مرجز کی تعریف غلط لکھی ہے۔ خواجہ عبدالغفور سرور کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آمدم برسر مدعا، نثر مرجز اس کو کہتے ہیں کہ وزن ہو اور قافیہ نہ ہو، مقابل مقفیٰ کے، کہ قافیہ ہو اور وزن نہ ہو اور یہاں یہ بھی سمجھنا چاہیے۔ کہ وزن میں قید منظور نہیں، مثلاً حضرت نظامی علیہ الرحمۃ کی نثر کا وزن یہ ہے مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن۔ حضرت ظہوری علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: راتیش سروبن گلشن فتح، خنجرش ماہی دریائے ظفر: یہ نثر مرجز ہے۔ وزن اس کا فعلاتن فعلاتن فعلن۔ کاتبوں نے مقفیٰ کرنے کے واسطے صورت بدل دی ہے اور کچھ تصرف کیا ہے کہ نثر نہ مرجز رہی نہ مقفیٰ بنے۔ چناں چہ اساتذۂ فن "لن تنالوالبرحتیٰ تنفقوا" اس آیت سراسر ہدایت کو نثر موجز کہتے ہیں اور اس کا وزن ہے، فاعلاتن فاعلاتن فاعلن" ویرزقہ من حیث لا یحتسب" اس کا وزن فعولن فعولن فعولن فعولن۔ بندے کی تحقیقات یہی ہے کہ نثر تین قسم پر ہے۔ مقفیٰ قافیہ ہے اور وزن نہیں، مرجز، وزن ہے اور قافیہ نہیں،

---

[1] جہانِ غالب، ص ۴۵

عاری ، نہ وزن ہے نہ قافیہ ۔ مسجع ہی مقفیٰ ہے کہ دونوں فقروں میں الفاظ ملائم اور مناسب ہم دگر ہوں ۔ نظم میں یہ صنعت آپڑے تو اس کو مرصع کہتے ہیں اور نثر اس صنعت پر مشتمل ہو تو اس کو مسجع کہتے ہیں ۔" لہ

مرزا قتیل نے "اقسام ثلثہ نثر" بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"نثر اسہ گونہ بنا گذاشتہ اند، عاری و مسجع و مرجز ۔ عاری عبارت از نثرے باشد کہ از وزن و قافیہ و دیگر تکلفات معریٰ بود ۔۔۔۔۔ و مسجع نثریست کہ آخر فقرۂ آں لفظے آرند و مقابل آں لفظ در فقرہ دیگر لفظے باشد کہ در روی و روف و ردفین وتاسیس و دخیل و حرف و دل و غیر آں موافق باایں لفظ باشد (یعنی ہم قافیہ ہو) و مقید بوزنے بہ مود ۔ و مرجز نثرے باشد کہ از قافیہ پاک بود اما فقرۂ اولیٰ با فقرۂ ثانی مساوی الوزن باشد ۔" ٢ہ

قتیل کے قول کے مطابق نثر تین طرح کی ہوتی ہیں (۱) عاری ، اس نثر کو کہتے ہیں، جس میں وزن ہوتا ہے نہ قافیہ (۲) مسجع وہ نثر ہوتی ہے، جس میں وزن نہیں ہوتا لیکن قافیہ ہوتا ہے ۔ (۳) مرجز ، جو وہ نثر ہے جس میں وزن ہوتا ہے، لیکن قافیہ نہیں ہوتا ۔ اس موضوع پر علمی بحث کرنا میرے لئے ممکن نہیں ۔ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اس مسئلے پر غالب کا ذہن صاف نہیں ہے، عاری اور نثر مرجز کے بارے میں ان کی بالکل وہی رائے ہے جو مرزا قتیل کی ہے ۔ اگرچہ مسجع کی تعریف میں ۔ غالب الجھے ہوئے ہیں ، پھر بھی خواجہ عبدالغفور کی نثر کی ان تینوں اقسام کے بارے میں ایک ایک لفظ وہی کہتے ہیں ۔ جو مرزا قتیل نے کہا ہے ۔ اوپر کے اقتباس میں غالب نے کہا ہے ۔ نثر تین قسم پر ہے ۔ مقفیٰ ؛ قافیہ ہے اور وزن نہیں ، مرجز ، وزن ہے اور قافیہ نہیں ۔ عاری ۔ نہ وزن ہے نہ قافیہ ۔ اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر غالب کا اعتراض برائے اعتراض ہے ۔ مرزا غالب اور مرزا قتیل کے بارے میں اس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے

لہ غالب کے خطوط : ۲ : ۵۸۷ ، ۵۸۸

٢ہ مرزا قتیل ، چار شربت ، ص ۵۹ ، بحوالہ سید اسد علی انوری ، قتیل اور غالب ، ۱۹۳۹ء ، ص ۷۵ ۔

کہ ۱۸۲۸ء (یعنی کلکتے کے ادبی معرکے سے قبل) غالبؔ نے قتیلؔ کو بُرا بھلا نہیں کہا۔
کیوں کہ مرزا قتیلؔ کا دس سال قبل انتقال ہو چکا تھا۔
کلکتے کے سفر میں جب انھوں نے لکھنؤ میں قیام کیا تو انھیں قتیلؔ کی شہرت اور
مقبولیت کا اندازہ ہوا ہو گا۔ کیوں کہ اس شہر میں صاحبِ اقتدار لوگوں میں ان کے مربی تھے
اس کے علاوہ اس شہر میں ان کے شاگردوں اور مداحوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ جب
غالبؔ کلکتے پہنچے تو اس وقت کلکتے میں فارسی داں حضرات بڑی تعداد میں موجود تھے۔
ان میں قتیلؔ کے شاگرد اور مدّاح بھی تھے۔ عین ممکن ہے کہ مرزا قتیلؔ کی مقبولیت سے
غالبؔ کو حسد ہُوا ہو۔ ادبی معرکے اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی پوری تفصیل بیان
کی جا چکی۔ جس کا اختصار یہ ہے کہ غالب ۱۸۲۸ء سے لے کر ۱۸۶۷۔ ۱۸۶۸ یعنی
وفات سے چند مہینے قبل تک مرزا قتیلؔ کو جس جرم کی سزا برا بھلا کہہ کر اور گالیاں
دے کر دیتے رہے، وہ اس غریب نے کیا ہی نہیں تھا۔

ڈاکٹر فرزانہ نسیم

مرزا غالبؔ کے ہریانوی شاگرد اور خاندان لوہارو کے شاعر

مرزا غالبؔ جیسی عظیم شخصیت اور غیر معمولی قد و قامت کے بلند پایہ شاعر کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ غالبؔ پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں افکار واقعات سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاعری اُن کے یہاں ایک مقدس سنجیدگی بن گئی ہے۔ انھوں نے اُردو غزل کو ایسے ایسے مضامین دیئے ہیں کہ جن سے اُردو شاعری فلسفیانہ مزاج سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

اُردو شعر و ادب میں شاگردوں کے کلام پر اصلاح دینے کا رواج ابتدا سے ہی ملتا ہے۔ غالبؔ نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا۔ اس لیے کہ حصولِ فن میں عبور حاصل کرنے اور نکھارلانے کے لیے کسی استاد کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں۔ بقول حفیظ جالندھری

شاعری گو منحصر ہے طبع موزوں پر حفیظ
سیکھنے کو فن، ضرورت ہے مگر استاد کی

غالبؔ اور غالبؔ کے متعلقین (تلامذہ اور پھر اُن کے تلامذہ) نے ان تمام اصولوں کو ہمیشہ ملحوظ رکھا جو رموز و نکات فن کی آگاہی کے لیے لازم تصور کیے جاتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ غالبؔ کے شاگردوں میں اتنے زیادہ صاحبِ طرز شعراء ملتے ہیں جنھوں نے دنیائے ادب میں ایک اونچا مقام پایا۔ جن کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

میں نے اپنے عنوان کے مطابق غالبؔ کے تلامذۂ گلشن سے ہریانوی

پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کا تعلق ہریانہ سے بہت گہرا تھا۔ ہریانہ سے غالب کے اس اٹوٹ رشتے کی وجہ نواب فیروزپور جھرکہ کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف تھے۔ کیونکہ ان کی بیٹی امراؤ بیگم سے غالب کی شادی ہوئی تھی۔

غالب کے مکاتیب پر نظر ثانی کرنے سے یہ بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ لوہارو خاندان سے بھی غالب کا بہت گہرا رشتہ تھا۔ ضیاء الدین احمد خاں جو فارسی اور اُردو کے شاعر تھے اُن کو غالب نے اردو اور فارسی میں اپنی جانشینی کی سند دی تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو غالب کا تعلق براہ راست ہریانہ سے نظر آتا ہے۔ غالب کے اس تعلق کو مضبوط کرنے میں خواجہ الطاف حسین حالی کا نمایاں کردار رہا ہے۔ اس مضمون میں میں نے غالب کے ان شاگردوں پر جن کا تعلق ہریانہ سے رہا ہے۔ ان کے مختصر سوانحی حالات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی جو غالب کے ان ممتاز تلامذہ میں سے ایک ہیں جو صحت زبان و ادب کے اعتبار سے غالب کے فکر و فن کی نمائندگی کرتے ہیں اور جنھوں نے فروغِ زبان و ادب اور شعری تربیت کے اقدام کو آگے بڑھایا اپنا یہ مضمون اُن ہی کے نام سے شروع کرتی ہوں۔

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلّد ہوں میر کا

خواجہ الطاف حسین حالیؔ ۱۸۳۷ء (۱۲۵۳ھ) میں پانی پت کے محلہ انصار میں پیدا ہوئے۔ حالیؔ ۹ برس کے ہی تھے جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کو پہلے سے ہی دماغی عارضہ تھا۔ جس سے وہ ان کی دیکھ بھال سے قاصر تھیں۔ اس لیے اُن کی تعلیم و تربیت بڑی بہن اور بڑے بھائی خواجہ امداد حسین منظہر کے سپرد ہوئی۔ زمانے کے رواج کے مطابق حالیؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی۔

ابھی تعلیم ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ گھر والوں نے انھیں خانہ داری کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ لیکن علم کی لگن نے ان کو گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ خاموشی سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور دلی جا پہنچے۔ دلی اس دور میں علم وفضل کا گہوارہ تھی مشہور اور قابل علما نے یہاں حلقہ ہائے درس قائم کر رکھے تھے۔ حالی بھی اس میں شریک ہو گئے۔ یہاں پر انھوں نے عربی کی تعلیم حاصل کی مگر کچھ عرصے بعد عزیزوں کے اصرار پر دلی کو خیرباد کہنا پڑا اور وہ واپس پانی پت چلے آئے۔ پھر بھی انھوں نے تحصیل علم اور مطالعے کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

غدر کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے انھیں الطاف حسین سے حالی بنا دیا۔ ہوا یہ کہ ۱۸۶۳ء میں وہ نواب محمد مصطفیٰ شیفتہ کے مصاحب اور ان کے صاحبزادے نقش بند خاں نہچور کے اتالیق ہو کر جہانگیر آباد (ضلع بلند شہر) چلے گئے۔ شیفتہ اُردو اور فارسی میں مومن اور غالب کے شاگرد تھے اور اس عہد کے جملہ اصحاب کمال اُن کے احباب میں سے تھے۔ اس لیے حالی کو بھی ان کی صحبت میں مفتی صدرالدین احمد خاں آزردہ مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر رخشاں اور دوسرے ارباب علم وفن سے ملنے کا موقع ملا۔ حالی ایک جگہ خود لکھتے ہیں کہ "۱۸۵۴ء میں جب میں دلی بغرض تعلیم آیا تھا تو ایک بار قلعہ معلی کے دیوان عام میں ایک مشاعرے میں میں نے غالب کو فارسی اور اردو غزل پڑھتے سنا اُس سے مجھے شاعری کا شوق ہوا" چنانچہ ایک دن میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور انھیں اپنا کلام سنایا تو انھوں نے فرمایا "کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیتا۔ لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہیں کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے" ابتدائی مشق کے زمانے میں خستہ تخلص کرتے رہے۔

شیفتہ جیسے سخن فہم اور سخن سنج کی صحبت اور سرپرستی نے انھیں بیرونی آلائشوں سے پاک کر دیا تو غالب کی شاگردی نے سونے پر سہاگے کا

کام کیا جس سے حالی جلدی ہی مرزا کے دوسرے شاگردوں اور اپنے ہمعصروں پر سبقت لے گئے۔

حالی تقریباً سات برس تک شیفتہ کے ساتھ رہے اور ان کی وفات کے بعد مختلف جگہ ہوتے ہوئے ۱۸۷۰ء میں لاہور پہنچے۔ یہاں اس زمانے میں اردو خاص توجہ کا مرکز بن رہی تھی۔ حالی کو یہاں سرکاری بک ڈپو میں کتابوں کی زبان درست کرنے کی خدمت سپرد ہوئی۔ یہاں سے تقریباً چار سال بعد وہ دہلی آ گئے۔ اور اینگلو عربک اسکول میں فارسی اور عربی کے مدرس مقرر ہوئے۔ سرسید احمد خاں سے ان کی ملاقات یہیں ہوئی۔ اور اس ملاقات کا پھل "مدّوجزرِ اسلام" یعنی مسدس حالی کی شکل میں ۱۸۷۹ء میں ظاہر ہوا۔ حالی اپنی ملازمت سے جب مستعفی ہو کر پانی پت واپس آئے تو اپنی ساری عمر علم و ادب میں بسر کر دی۔ حکومتِ وقت نے ان خدمات کا اعتراف یوں کیا کہ جون ۱۹۰۴ء میں انھیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔

نثر میں ان کے کارنامے تین بلند پایہ کتابوں کی شکل میں ہیں۔ جو اردو میں کلاسکس کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید لکھ کر انھوں نے ان تینوں بزرگوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر تنقید کی بنیاد ڈالی اور شعر و شاعری کے متعلق ایک مکمل اور حیات آفریں نظریہ پیش کیا۔ حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب، حیاتِ سعدی وہ شاہکار تصانیف ہیں جن پر اربابِ فن ہمیشہ نازاں رہیں گے۔ ان کتابوں میں قلمی چہرے اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ منہ سے بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حیاتِ جاوید میں سرسید یادگارِ غالب میں مرزا غالب اور حیاتِ سعدی میں شیخ سعدی کا تذکرہ ہے۔

حالی نے محمد حسین کے لگائے ہوئے پودے کی آبیاری کر کے ہماری فرسودہ شاعری کو نئی "ڈگر" پر ڈالنے کی جو خدمت انجام دی وہ ان کا ایک عظیم

کارنامہ ہے۔
یوں تو غالبؔ پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مختلف زاویوں سے اُن کی شخصیت اور کلام کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔ لیکن یادگارِ غالبؔ میں حالیؔ نے غالبؔ کی شاعرانہ عظمت پر اس طرح گفتگو کی ہے کہ ان کی شاعری کی اہم خصوصیات سامنے آجاتی ہیں۔ حالیؔ نے پہلی بار ایسے نکتوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے واقفیت کے بغیر کلامِ غالبؔ کے شعری محاسن کو پوری طرح سمجھنا مشکل ہے۔
یادگارِ غالبؔ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مرزا غالبؔ کی پہلی سوانح عمری ہے۔ جو ایک ایسے شخص نے لکھی جو غالبؔ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اور اُس زمانے کی دہلی کے ادبی، تہذیبی اور تاریخی حالات سے بھی بہ خوبی واقف تھا۔ حالیؔ کو مرزا غالبؔ سے شاگردی کی نسبت حاصل تھی۔ اس طرح تعلّق خاطر اور ہمدردی کا وہ جذبہ بھی موجود تھا جس کے بغیر اچھی سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی۔

حافظ قاضی عبدالرحمٰن پانی پتی تحسینؔ

یہ حضرت محمد جلال الدین کبیرالاولیا کی اولاد میں تھے۔ گویا ان کا اور غالبؔ کے ایک دوسرے شاگرد باقر سہاری کا خاندان ایک ہے۔ ان کے والد مولوی عبدالہادی تھے۔ پانی پت کے مشہور عالم قاضی محمد ثناءاللہ بھی اسی خاندان کے فرد ہیں۔ تحسینؔ نے ضروری علم دلّی میں حاصل کیا۔ حافظ قرآن تھے۔ تمام عمر یادِ خدا تقویٰ و قناعت میں بسر کر دی۔ حالیؔ سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ حالیؔ کے دو فارسی خط اُن کے نام شائع ہو چکے ہیں۔ دیوان شائع نہیں ہوا۔ ان کی فارسی کی طرف زیادہ توجہ تھی۔

نمونۂ کلام

تو زخم خنجر قاتل نخوردی
چہ دانی لذت بسمل شدن را
بسودا قوت وستم گر این ست
توانم چاک زد جیب کفن را
دروغے کرد از صدق محبت
بمردن زندہ نام کوہکن را

آنم کہ حریفیم نگہ عشوہ گراں را
تیز است گر ایں دشنہ مرا ہم جگرے ہست

(تلامذۂ غالب صد ۱۱۴)

منشی شکور احمد پانی پتی وکیلؔ

منشی شکور احمد پانی پتی وکیلؔ جیسا کہ اُن کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ پانی پت ہریانہ کے رہنے والے تھے۔ "تلامذۂ غالب" اور مالک رام کے یہاں ان کا ذکر اور غزل ملی ہے۔ بہت تلاش کے بعد بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

نمونۂ کلام

ملے یوں لطف میکشوں کو پیر میخانہ
گرے جو بوند ساغر سے بنے تصویر میخانہ
مے گلرنگ سے دل کی دورنگی دور ہو جائے
کوئی ساغر خدا کی راہ کا دے پیرِ میخانہ

الٰہی! کیا ہوا پلٹی یہ کیسا انقلاب آیا
جہاں مسجد تھی کل تک آج ہے تعمیر میخانہ
(تلامذۂ غالب صہ ۵۵۲)

مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب

مرزا شہاب الدین احمد خاں نواب ضیا۔ الدین احمد خاں نیر رخشاں کے بڑے صاحبزادے تھے۔ یہ ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوئے شروع سے ہی تعلیم و تربیت اپنے والد کی نگرانی میں حاصل کی۔ بہت ذہین اور متین انسان تھے۔ ان کی عملی خوبیوں کی بدولت چھوٹی سی عمر میں ہی انگریزی حکومت نے دہلی کا آنریری مجسٹریٹ مقرر کر دیا تھا۔ یوں بھی نیرؔ و غالبؔ کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ اس لیے کلام تفکر و اخلاق کی چاشنی سے بھرپور ہے۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے غالبؔ کے محبوب شاگرد تھے۔ استاد نے ہی شہاب کی مناسبت سے ثاقب تخلص عطا کیا تھا۔ مگر عمر نے وفا نہ کی اور ۲۹ برس کی عمر میں ہی غالبؔ کی وفات کے دو مہینے بعد ۱۹ اپریل ۱۸۶۹ء کو وفات پائی۔ غالبؔ کی وفات کے وقت بھی تپ دق کی وجہ سے بخار میں مبتلا تھے۔ جنازے کے ساتھ چلنے کی طاقت نہیں تھی پاؤں پر ورم آچکا تھا۔ اس لئے پالکی میں نظام الدین تک اپنے مشفق استاد کو پہنچا کر آئے اور زبان حال سے کہا "آپ چلیں ہم بھی آتے ہیں"۔

ثاقبؔ کے پانچ بچے تھے مرزا شجاع الدین احمد تاباںؔ سہا۔ الدین احمد خاں طالبؔ، سراج الدین احمد خاں سائلؔ، ممتاز الدین احمد خاں مائلؔ اور ایک صاحبزادی اختر سلطان بیگم۔ چاروں بیٹوں کو شاعری ورثے میں ملی۔ تاباںؔ اور سائلؔ نے خوب اچھی شہرت حاصل کی۔

ثاقبؔ قدم شریف میں اپنے چچا نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروزپور جھرکہ کے پہلو میں دفن ہیں۔ کلام میں تصوف اور اخلاق کی چاشنی ہے۔

بولے" روداد موسیٰ و طور
سُن لی ہو تو دیکھنے کو آئیں
"بسم اللہ! ہم اُٹھائیں پردہ
پر اُن سے کہو کہ تاب لائیں"

کیوں وعدہ کرو بے خبر آجاؤ کسی وقت
ہوں وصل کا خواہاں ہیں مشتاق خبر کا

نہیں عقل سے عشق خالی کہ اس میں
بڑے تجربے ہم کو حاصل ہوئے ہیں
غلط فہم ہیں عاشقان بخاری
کہ محوِ تماشائے محل ہوئے ہیں

(تلامذہ غالب، خاندان لوہارو کے شعراء)

منشی ہیرا سنگھ دہلوی درد

ہیرا سنگھ درد رائے چھجمل کے چھوٹے بیٹے اور منشی جواہر سنگھ جوہر تحصیلدار کے چھوٹے بھائی تھے۔ دہلی میں فتحپوری مسجد اور سرائے احمد بائی کے قریب گندی گلی میں رہا کرتے تھے۔ کچھ دن کے لیے اپنے بڑے بھائی کی سفارش سے روہتک میں ملازم رہے۔ صرف ان معلومات کے علاوہ اس سے زیادہ ان کے حالاتِ زندگی اور کلام کہیں سے دستیاب نہیں ہوتا۔

(تلامذہ غالب ص ۱۷۹)

مرزا حسین علی خاں شاداںؔ

شاداںؔ نواب زین العابدین خاں عارف کے چھوٹے صاحبزادے اور مرزا غالبؔ کے بے حد لاڈلے پوتے تھے۔ جب عارفؔ کا انتقال ہوا اس وقت شاداںؔ صرف دو سال کے تھے۔ اُن کی والدہ کا انتقال اس سے قبل ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ بھی امراؤ بیگم کی آغوشِ شفقت میں پلے۔

۱۸۵۷ء کے خونی ہنگامے کے بعد دلیؔ میں ایک معرکہ کا مشاعرہ ہوا تھا۔ مشاعرے میں دلیؔ کی تباہی اور یہاں والوں کی بربادی پر سب شعراء اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کی یاد میں آنسو بہا رہے تھے۔ ہر طرف سرد آہیں تھیں۔ اس عالم میں شاداںؔ جو اس وقت صرف نو یا دس برس کے تھے۔ شعر پڑھنے کھڑے ہوئے تو سب کی نظریں اُن کی جانب اُٹھ گئیں کہ دیکھیں غالبؔ کی گود کا پلا ہوا کیا کہتا ہے۔ اُس وقت شاداںؔ کا یہ شعر امید کی کرن بن گیا۔

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی

شاداںؔ نے مرزا غالبؔ سے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ اُن کے انتقال کے بعد حالیؔ اور سالکؔ سے مشورہ کیا۔ شاداں کی شادی ان کے خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی باقر علی خاں کا جوانی میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ جس کی جدائی نے دماغی توازن بگاڑ دیا تھا۔ اسی غم میں باقر علی خاں کی موت کے ٹھیک تین سال بعد عالمِ شباب میں صرف ۲۹ سال کی عمر میں ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء کو انتقال ہو گیا۔

شاداںؔ اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی فکرِ سخن کرتے تھے اُردو میں شاداںؔ

اور فارسی میں تخلص خیالی تھا۔ ان کا مجموعہ کلام رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ غالب کے رنگ کے کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

تری ہر ادا پہ مرتا، ترے ہر سخن پہ جیتا
مجھے موت و زندگی پہ اگر اختیار ہوتا

شب ہجراں میں جو تڑپا میں سحر ہونے تک
مل گیا خاک میں اس بت کو خبر ہونے تک

شرم می آید خیال رہ بجنگ آسماں
کایں جوانے ہست دادیک پیر و برس سالہ ست

(تلامذۂ غالب)

نواب محمد مصطفیٰ خاں دہلوی شیفتہ

نواب محمد مصطفیٰ خاں ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں دلّی میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ یہ دلّی میں پیدا ہوئے تھے لیکن جاگیر گوڑ گاؤں میں ملی تھی۔ ان کی تعلیم کے تمام مدارج بھی مختلف اساتذہ کی نگرانی میں یہیں طے ہوئے۔

شیفتہ کے غالب سے بہت گہرے تعلقات تھے۔ غالب کو اُن پر ناز تھا۔ وہ ان کی رائے کو خاص وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے اور اُن کے پایۂ سخن سنجی کے معترف تھے۔ غالب نے اپنے زمانے کے مشہور اور مستند فارسی دانوں کا اپنی ایک غزل میں ذکر کیا ہے۔ اس میں ان کا ذکر بھی موجود ہے۔ ۱۸۴۷ء میں غالب پر جب (جوا خانے) کو قائم کرنے کے سلسلے میں

ابتلا آیا اور وہ چھ ماہ کے لیے قید خانے بھیج دیئے گئے۔ تو وہ شیفتہ ہی تھے جنہوں نے دامے، درمے، قدمے، ہر طرح غالب کی خدمت کی جب کہ اس زمانے میں مرزا کے بعض رشتہ دار اور نہایت عزیز دوست بھی پیٹھ دکھا گئے تھے۔ غالب نے قید کے دوران تاریخی نظم لکھی تھی۔ اس میں انہوں نے شیفتہ کی خدمت کا پرزور اعتراف کیا ہے۔ غالب نے ان کی مدح میں ایک مستقل قصیدہ بھی لکھا تھا۔ جو ان کی فارسی کلیات میں موجود ہے۔

شیفتہ کے والد نواب مرتضیٰ خاں مہاراجہ جسونت رائے ہلکر کے لشکر میں تھے یہ اس وقت کا ذکر ہے جب لارڈ لیک جسونت رائے ہلکر کی سرکوبی کے درپے تھا۔ نواب مرتضیٰ کی کوشش اور حسن تدبیر سے یہ لڑائی صلح وصفائی پر ختم ہو گئی۔ لارڈ لیک اُن کی خدمت سے بہت خوش ہوا۔ اور انھیں تین لاکھ سالانہ کی جاگیر ہوڈل وپلول (جو اس وقت ضلع گوڑگاؤں میں تھی) میں عطا کی۔ جب نواب مرتضیٰ خاں کی وفات ہوئی تو ہوڈل وپلول کی جاگیر انگریزوں نے واپس لے لی۔ لیکن خاندان کی گذشتہ خدمت کا خیال کرتے ہوئے اس کی جگہ بیس ہزار روپیہ سالانہ زر نقد کی صورت میں مقرر کر دیا۔

شیفتہ اُردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ پہلے مومن سے اور ان کی وفات کے بعد غالب سے اصلاح لی۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا بہت سا کلام غدر کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔ شیفتہ بلند پایہ نقاد سخن بھی تھے۔ اُردو شاعری کا مشہور فارسی تذکرہ "گلشن بیخار" ان ہی کی تصنیف ہے جو ۱۸۳۷ء میں شائع ہوئی۔ شیفتہ کا ۶۳ برس کی عمر میں ۱۸۶۹ء میں انتقال ہوا۔ شیفتہ کے کلام سے متعلق کسی رائے کا اظہار کرنا تحصیل حاصل ہے۔

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین
دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی گھبرا آیا

وہ مجھ سے خفا ہے تو اسے یہ بھی ہے زیبا
پر شیفتہ! میں اس سے خفا ہو نہیں سکتا

یاد نے جس کی بھلایا سب کو
اس کی میں یاد بھلاؤں کیوں کر

کہتا ہوں جو غیر سے نہ ملیئے
کہتا ہے کہ "کیا میں بے وفا ہوں"

۱۔ تلامذۂ غالب
۲۔ اُردو ادب میں ہریانہ کے ادیبوں کا حصّہ

نواب سعید الدین احمد خاں طالب

طالب نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کے چھوٹے بیٹے اور نواب احمد بخش خاں فخر الدولہ اور رستم جنگ کے پوتے تھے۔ یہ ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ شعر و ادب کا ذوق باپ دادا سے ترکے میں پایا تھا۔ بارہ چودہ سال کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ پہلے اپنا کلام بڑے بھائی مرزا شہاب الدین خاں کو دکھایا پھر سالک سے اصلاح لی۔ چونکہ مرزا غالب کی آغوش محبت میں پلے تھے۔ جو کچھ کہتے بعد اصلاح ان کی نظر سے گذرتا۔ ایک جگہ کہتے ہیں[1]

یہ سب کچھ ہے طفیل حضرت غالب
وگرنہ ہم میں طالب خاک طاقت ہے

ایک مقطع میں اپنے والد گرامی قدر کی طرف اشارہ کیا ہے

---

[1] خاندان لوہارو کے شعراء۔ حمیدہ سلطان احمد ص ۵۷

حضرت نیر کا سکہ ہے جہاں میں چل رہا
ہے سخن کی مملکت طالب یہاں جاگیر میں

حُسن صورت کے ساتھ حُسن گفتار کی بدولت جہاں وہ جاتے جانِ محفل بن جاتے۔ ۱۸۴۵ء میں آنریری مجسٹریٹ اور پھر ۱۸۴۹ء میں لیفٹننٹ گورنر پنجاب سر رابرٹ ایجرٹن کی مردم شناسی کے طفیل عارضی (E.A.C) کمشنر ہو کر فیروز پور میں تعینات ہوئے۔ ۱۸۸۰ء میں محکمانہ امتحان پاس کر لیا تو ملازمت میں مستقل کر دیئے گئے۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں (والد) ان کی ملازمت سے مرتے دم تک رنجیدہ رہے۔ ان کی شان امارت کے خلاف بات تھی کہ کسی خاندانی رئیس کو خدا کا دیا سب کچھ ہوتے ہوئے ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نیّر رخشاں کے انتقال کے بعد ملازمت سے استعفا دے دیا اور اپنی جائداد کا کام سنبھالا۔

ان کا اکثر کلام دلی کی شستہ و رفتہ زبان میں ہے روزمرہ اور فصاحت ان کے کلام کی امتیازی شان ہے۔ فارسی نواب طالب کے لیے مادری زبان کی طرح تھی، اس لیے وہ کبھی کبھی فارسی ترکیبیں بھی استعمال کرتے تھے۔ اُن کا قلمی نسخہ کتب خانہ لوہارو میں تھا۔ جواب رضا لائبریری لوہارو سیکشن رام پور میں موجود ہے۔ ان کا شعر پڑھنے کا انداز نہایت دل آویز تھا۔ گھوڑے کی سواری کا بھی بہت شوق تھا۔

نو مشقی کے ابتدائی زمانے میں ثاقب اور غالب سے اصلاح لی۔ ان کی وفات کے بعد چند دن سالک اور مولانا حالی سے مشورہ کرتے رہے۔ اور آخر کار اپنے والد کے کہنے پر میر مہدی مجروح کو کلام دکھانے لگے۔

طالب کی شادی خاندان سے باہر بادشاہ بیگم دختر آغا سید احمد شاہ نواب سردھنہ سے ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی۔ نواب طالب کا انتقال ۱۹۲۰ء کو

حرکت قلب بند ہوجانے کا باعث ہوا۔ اولاد کوئی نہیں چھوڑی اور اپنی ذاتی کوٹھی میں اپنے والد کی پائنتی قطب صاحب میں دفن ہوئے۔

ان کے چند شعر درج ہیں۔

ساقیا ہے بزمِ آخر دور بھی ہے آخری
دیکھنا محروم رہ جائیں نہ ایک ساغر سے ہم

اُٹھایا جو رُخ سے بزم میں اس نے نقاب کو
شوخی نے کچھ بڑھا دیا لطفِ حجاب کو

ترے ساتھ تھے دل کے ارمان سارے
نہیں جب سے تو کوئی ارمان نہیں ہے

طالب نے میر مہدی مجروح کی تاریخ وفات کہی اُن کا کہا ہوا قطعہ لوحِ مزار پر کندہ ہے۔ اپنے والد کی وفات پر بھی طالب نے فارسی میں قطعہ کہا تھا۔

یادگارِ غالبِ معجز بیاں ۔۔۔ میر مہدی سید والا تبار
بد کلامش سر بسر آہ و فغاں ۔۔۔ چوں تخلص بود مجروح فگار
کرد از دنیا چوں آہنگِ سفر ۔۔۔ گفت "اغفرلی الٰہی" چند بار
طالبا دیگر مرنجاں فکر را ۔۔۔ راز فوتش "اغفرلی" برار

ضمیمہ قومی آواز لکھنؤ۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۷ء صہ ۱

نواب زین العابدین خاں عارف

نواب زین العابدین خاں عارف ۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ابھی خورد سال ہی تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ان کی والدہ بنیادی بیگم صاحبہ نے ان کی پرورش زمانے کے دستور کے مطابق کی اور اعلیٰ تعلیم دلائی۔ نواب زین العابدین خاں عارف کو سرکار سے ڈھائی سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ عارف کی شادی اکیس سال کی عمر میں نواب احمد بخش خاں رئیس فیروز پور جھرکا کی صاحبزادی نواب بیگم سے ہوئی تھی۔ عارف کے نام سے دنیائے ادب میں کون واقف نہیں بھلا مرزا غالب کے چہیتے عارف کو کون نہیں جانتا۔ عارف کو غالب صرف اسی لیے نہیں چاہتے تھے کہ وہ ان کی بیوی کے بھانجے تھے۔ بلکہ ان کی جودتِ طبع اور ذہن رسا نے مرزا کی محبت حاصل کی تھی۔ وہ طرزِ سخن میں غالب کے پیرو تھے۔ اُن سے اصلاح لیتے تھے۔ مرزا غالب کو اس خوش فکر ہونہار نوجوان سے جس قدر محبت تھی۔ اس کا اظہار ان کے فارسی قطعہ سے ہوتا ہے۔

آں پسندیدہ خوئے عارف نام
کہ زخش شمع دودماں منست
آں کہ در بزم قرب و خلوتِ اُنس
غمگسار و فراج داں منست

عارف نے بہت کم عمری میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے نانا مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے تخلص کی رعایت سے عارف تخلص اختیار کیا۔ طبیعت میں غضب کی آمد تھی۔ شروع میں شاہ نصیر سے اصلاح لی لیکن بہت کم وقت ان کے رنگ میں ایک دیوان کہا "مطلعِ مہر سعادت"

کے نام سے مرتب کیا۔ لیکن جب شاہ نصیر دکن سدھارے تو عارف نے غالب سے استفادہ شروع کیا۔ رنگ سخن بھی بدل دیا دیوان بھی تلف کر دیا۔ اور طرز سخن میں مرزا کی پیروی کرنے لگے۔ اور دوسرا دیوان مرتب کیا۔ انہی خوبیوں کے باعث مرزا غالب ان پر فخر کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عارف اُردو میں میرے صحیح جانشیں ثابت ہونگے۔ عارف نے غالب کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی ہے، اور اس میں وہ کامیاب رہے۔ ان کی ایک غزل اور ایک مخمس بھی غالب کی غزلوں پر پیش ہے۔

سب سے بہتر ہے مجھ پہ مہرباں کوئی نہ ہو
ہم نشیں کوئی نہ ہو اور راز داں کوئی نہ ہو

عارف خوش عقیدہ مسلمان تھے۔ انھوں نے بزرگان دین کی شان میں کافی سلام اور منقبت کہے ہیں۔

سلام قبلۂ حاجات دو جہاں یہ ہے
جہاں کو سجدہ روا جس کے آستاں پہ ہے

ایزد جان آفریں کو کر کے کہتا ہوں گواہ
گر نہ تیرا عشق ہو مجھ کو تو میرا رو سیاہ

عین عالم شباب میں عارف جن کو کبھی مرزا "راحت روح ناتواں" اور کبھی "شمع دودماں" کہتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں پینتیس ۳۵ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اور مرزا غالب کے ٹوٹے ہوئے دل سے کراہ کی صورت میں یہ صدا نکلی۔

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ان کی قبر بھی مرزا غالب کے احاطے میں ہے۔ عارف کی موت پر جو غالب نے دردناک نوحہ لکھا تھا۔ وہ اردو نظم کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

(تلامذۂ غالب)

نواب علاء الدین احمد خاں علائی والئ لوہارو

نواب علاء الدین احمد خاں امین الدین خاں کے فرزند ارجمند تھے۔ امین الدین خاں پہلے والئ لوہارو ہیں جو ۱۸۱۴ء میں فیروز پور جھرکا میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی محمد وزیر بیگ عرف مینڈھو خاں رسالدار سلطنت اودھ کی صاحبزادی ولی النساء بیگم سے ہوئی۔ ان بیگم سے علاء الدین احمد خاں ۲۵ اپریل ۱۸۳۲ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم شروع سے ہی غالب کی نگرانی میں ہوئی۔ مرزا صاحب انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان میں فارسی، ترکی اور عربی کی استعداد عالمانہ تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ لیکن اُس زمانے کے ذوق کے مطابق فارسی میں کلام زیادہ ہے۔ غالب نے انھیں ایک سند میں اپنے بعد فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا تھا۔

علائی کا زیادہ وقت علمی اور ادبی مشاغل میں گذرتا تھا۔ انھوں نے لوہارو میں ایک چھاپہ خانہ بھی "فخر المطابع" کے نام سے قائم کیا تھا۔ جہاں سے علمی و ادبی کتابیں شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے ایک پندرہ روزہ اخبار "امیر الاخبار" کے نام سے بھی جاری کیا تھا۔ علائی شطرنج کے بہت اچھے

کھلاڑی تھے۔

علائی اپنے والد کی زندگی میں لوہارو کے نواب ہو گئے تھے۔ کیونکہ نواب امین الدین احمد خاں بیمار رہنے لگے۔

نواب علائی غالب کے بہت چہیتے شاگرد تھے۔ غالب علائی کو کبھی "اے میری جاں" اور کبھی "مرزبان لوہارو" کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور اکثر اپنے شعروں میں علائی کا ذکر کرتے تھے۔

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیدادِ گرِ رنج فزا اور سہی

علائی کی وفات ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو ہوئی۔ قطب صاحب میں کوٹھی مرزا بابر والی میں اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ امیر مینائی نے تاریخ کہی۔

مزار سایۂ یزداں علاء الدین احمد خاں

افسوس کہ انھوں نے اپنے کلام کو کبھی جمع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس پایے کے وہ عالم و فاضل تھے اس کے مقابلے میں کوئی بڑی علمی یادگار نہیں چھوڑی۔ ایک قلمی بیاض جو پہلے لوہارو کے کتب خانے میں تھی۔ اب رضا لائبریری میں ہے۔ اُن میں سے کچھ اشعار مالک رام صاحب نے تلامذۂ غالب میں شامل کئے ہیں۔

الطافِ حق کو وقتِ مصیبت تو یاد رکھ
ہرگز نہ ہو بلا و عنا میں تو نا صبور

روتا ہے وقت رنج و بلا بھول کیوں گیا
آرام و عافیت وہ تمام عیش و سرور

دنیا کو خیر و خوبی میں لیل و نہار کو
کب جانتی ہے خلق کہ کیوں کر گزر گئے

فارسی کا کلام

پیدا نہ بود بیش ازیں خود عیان ما
برداشت پردہ گریہ ز راز نہان ما
مشکل بہ بیں چگونہ ز خویشتن خبر دہم
کاتش بنامہ ورزدہ سوز بیان ما

(تلامذۂ غالب - مالک رام
خاندان لوہارو کے شعراء - حمیدہ سلطان

نواب غلام حسن خاں محوؔ

نواب الٰہی بخش معروفؔ کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک امراؤ بیگم جو غالبؔ کے نکاح میں تھیں۔ چھوٹی بنیادی بیگم جن کا نکاح نواب غلام حسین خاں سرور سے ہوا تھا۔ ان سے ان کے دو صاحبزادے نواب زین العابدین خاں عارفؔ اور غلام حیدر خاں تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان میاں بیوی میں نبھ نہ سکی۔ ان سے ان کے چار صاحبزادے ہوئے۔ جن میں نواب غلام حسین خاں محوؔ سب سے بڑے تھے۔ گویا نواب عارفؔ کے سوتیلے بھائی غلام حسین خاں تھے۔ مگر عارف

کو اپنے سگے بھائیوں کی طرح چاہتے تھے۔ محوؔ نے ذوقؔ اور غالبؔ دونوں سے استفادہ کیا۔

محوؔ شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ محوؔ اس سوسائٹی کے رکن تھے۔ جو جلسہ شطرنج کے نام نواب علاء الدین احمد خاں علائی نے قائم کی تھی۔ محوؔ نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے متعلق ایک کتاب "نصرت نامہ گورنمنٹ" کے نام سے لکھی تھی۔ جس کا خلاصہ خواجہ حسن نظامی نے "غدر کا نتیجہ" کے عنوان سے چھاپا ہے۔

نمونۂ کلام

دل لگانے کا مزا دیکھ لیا آخر کار
ہم نہ کہتے تھے کہ اے محوؔ پشیماں ہوگا

گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں لب بام پہ وہ بھی
اتنا تو ہوا ہے مرے نالوں کے اثر سے

سخت جاں محبت سے تیری اے ستمگر ہو گیا
بت پرستی کرتے کرتے میں بھی پتھر ہو گیا

(تلامذۂ غالب۔ مالک رام)

میر مہدی حسین دہلوی مجروحؔ

مجروحؔ کی پیدائش ۱۸۳۳ء کے لگ بھگ ہوئی۔ عقیدے کے لحاظ سے اثنا عشری شیعی تھے۔ انھوں نے شادی بہت دیر سے قریب ۴۰ سال کی عمر

میں کی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں پانی پت چلے گئے۔ وہاں مرزا غالب کے ایک دوسرے شاگرد خواجہ الطاف حسین حالیؔ کی محلہ انصار میں سکونت تھی۔ مجروحؔ انھیں کے ایک مکان میں مقیم رہے۔ فساد ختم ہونے کے بعد (لگ بھگ پانچ سال کے بعد) واپس دہلی چلے آئے لیکن "ہم نے یہ مانا رہے دلی میں، پر کھائینگے کیا" اب وہ دلی نہیں تھی جسے چھوڑ کر پانی پت گئے تھے، ناچار تلاش روزگار میں نکلے۔ الور میں مہاراجہ شیودھیان سنگھ کے یہاں ٹھکانا مل گیا۔ پہلے نائب تحصیلدار رہے لیکن ۱۸۷۳ء میں شیودھیان سنگھ کی معزولی کے بعد مہاراجہ جے پور نے دستگیری کی وہاں نائب کوتوال مقرر ہو گئے۔ مگر پھر مہاراجہ جے پور کے انتقال کے بعد واپس دلی آنا پڑا۔ قسمت نے یاوری کی اور نواب حامد علی خاں بہادر والی رام پور نے قدردانی کی اور اپنے پاس بلالیا۔

تلامذۂ غالب کی طویل فہرست میں چند شاگرد ایسے بھی ہیں جن کے باعث غالب کی زندگی کے بعض اہم پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں اور ان کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوئے ہیں۔ میر مہدی حسن مجروحؔ غالب کے ایسے ہی چہیتے شاگرد تھے۔ جن کے متعلق حالیؔ نے خوب کہا تھا۔

داغ و مجروحؔ کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی میں بیسیوں خط ان کے نام ہیں۔ مرزا کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا وہ خاص پائے کی چیز ہے۔

مجروحؔ کو کربلا اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کا شوق تھا۔ لیکن صحت کی خرابی کے باعث تنہا سفر کرنے سے گھبراتے تھے۔ بینائی بھی کافی کمزور ہو گئی تھی۔ کسی سہارے کے بغیر نقل و حرکت تک دشوار ہو گئی تھی۔ اسی بے بسی اور تکلیف میں ۱۵ مئی ۱۹۰۳ئہ کو وفات پائی۔

مجروح کا کلام دلی کی صاف ستھری نکھری ہوئی زبان میں ہے۔ خاص کر جو غزلیں چھوٹی بحر میں ہیں بہت دلآویز ہیں۔

ہجر کے رنج، وصل کی راحت
لطف ہر ایک کا جدا دیکھا
جان بھی مفت میں گئی مجروح
دل لگانے کا کچھ مزا دیکھا

طلب کیسی، بلانا کیا، وہاں خود جا پہنچتے ہیں
اگر عالم یہی چندے رہا بے اختیاری کا

تو تو کچھ اور ہو گیا مجروح
دل تو اٹکا نہیں کہیں اے یار

بھولے بھولے سے جو رہتے ہو کہو خیر تو ہے؟
یہ تو کچھ عشق کا انداز ہے پایا جاتا

(تلامذہ غالب
میر مہدی مجروح۔ حیات اور تصانیف ڈاکٹر محمد فیروز)

نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں

نیر رخشاں نواب احمد بخش خاں والی فیروز پور جھرکا لوہارو کے نور نظر اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے بھتیجے تھے۔ نواب احمد بخش خاں نے بے مثل شجاعت کی بدولت فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ کا خطاب پایا۔ اور فیروز پور جھرکا ساگر میں

پنہانا، بچھوڑ، نگینہ۔ لارڈ لیک نے ان کو جاگیریں عطا کیں، مہاراجہ بختاور سنگھ والئ الور نے لوہارو کا پرگنہ جاگیر میں دیں۔

نواب ضیاء الدین احمد خاں ۱۸۲۱ء اکتوبر میں فیروز پور جھرکا میں پیدا ہوئے۔ اور جب نواب احمد بخش خاں کی وفات ہوئی اُس وقت یہ صرف چھ برس کے تھے۔ چونکہ والد کے انتقال کے وقت یہ نابالغ تھے۔ اس لیے نظم ونسق بڑے بھائی کے ہاتھ میں رہا۔ بالغ ہونے پر انھوں نے مطالبہ کیا کہ ریاست میں برابر کا شریک سمجھا جائے ورنہ اس کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر انگریزی حکومت نے یہ دونوں تجویزیں نامنظور کر دیں اور فیصلہ کیا کہ بڑے بھائی امین الدین احمد خاں ضیاء الدین احمد خاں کو اٹھارہ ہزار روپے سالانہ وظیفہ دیتے رہیں۔ اُس پر نواب ضیاء الدین احمد لوہارو سے مستقل دلی میں آگئے۔ اور مرتے دم تک یہیں رہے۔

ضیاء الدین احمد خاں کی تعلیم وتربیت گھر پر ہی ہوئی۔ علم وتفسیر وحدیث مولوی کریم اللہ سے ادب وفقہ مفتی صدر الدین آزردہ سے فلسفہ ومنطق مولانا فضل حق سے حاصل کئے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ عربی اور ترکی بھی اچھی جانتے تھے۔ اس کے علاوہ نجوم اور ہیئت میں بھی اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔ تاریخ پر پورا عبور ان کو حاصل تھا۔ جغرافیہ میں ان کی دستگاہ کا اعتراف سب نے کیا ہے۔ بالخصوص ایشیا کے مختلف ممالک کی تاریخ پر ایسا عبور تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ تمام عمر مطالعۂ کتب میں گذری۔ ان کے کتب خانے میں مختلف علوم کی مستند اور بلند پایہ کتابیں موجود تھیں۔ مگر افسوس کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء میں نذر آشوب ہوگیا۔ نواب صاحب علم وادب کے ایسے عاشق تھے کہ انھوں نے غدر کے بعد کافی کتابیں اپنے کتب خانے میں فراہم کر لیں۔

نیّر رخشاں اپنے استاد کے پایۂ ناز شاگرد ثابت ہوئے۔ مرزا کو ان پر فخر تھا۔ فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے۔ غالب نے اپنی زندگی میں سند خلافت لکھ دی تھی۔ خلیفہ اوّل نیّر رخشاں اور خلیفہ دوم نواب علاء الدین احمد خاں

علائی مقرر ہوئے۔ نیر رخشاں کا تمام کلام ۱۸۵۷ء میں ضائع ہو گیا تھا۔ بعد میں جو کچھ جمع ہو سکا۔ اُسے ان کے چھوٹے صاحبزادے نواب سعید الدین احمد خاں طالب نے "جلوہ صحیفہ زریں نیر رخشاں" کے تاریخی نام سے ۱۹۱۵ء میں شائع کرایا تھا۔

موت سے پہلے صرف تین روز بخار رہا۔ اور چوتھے دن ۱۳ رمضان (۱۳۰۲ھ) ۲۷ جون ۱۸۸۰ء کے دن دوپہر کے وقت رحلت فرمائی اور مہرولی میں حضرت خواجہ بختیار کاکی کی درگاہ میں اپنے والد ماجد اور برادر بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ مولانا حالی نے اس موقع پر دو رباعیاں کہی تھیں۔

غالبؔ ہے نہ شیفتہ نہ نیرؔ باقی
وحشتؔ ہے نہ سالکؔ ہے نہ انورؔ باقی
حالیؔ اب اسی کو بزم یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبک طنّار
آتے ہی خزاں کے سب گر گئے پرواز
تھی باغ کی یادگار اِک بلبل زار
تو اس کی بھی کل سے نہیں آئی آواز

نمونۂ کلام

شاید بہار آئی کہ جوشِ جنوں
پھر آ رہا ہے جامہ و دستار تار تار
رخشاں یہ غنچے قیس کے ملنے سے کیوں ہوئے
ملتے ہی ہیں بہم نُبت عبار تار تار

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں
ساقیا! لیجیو سنبھال ہمیں
میرے غصے نے ایک دم میں کیا
مژدۂ صد ہزار سال ہمیں

(تلامذہ غالب)

مولوی امو جان دہلوی ولیؔ

ولیؔ کے بارے میں کچھ تو کچھ زیادہ نہیں مل پایا صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ یہ پیشہ کے اعتبار سے مدرس تھے۔ پہلے دلی میں ملازم تھے بعد میں فیروز پور جھرکا کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے گئے اور ۱۹۰۲ء میں پنشن پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شوق فرماتے تھے۔ "رباعیات عجائبات امو جان ولیؔ" کے تاریخی نام سے مجموعہ رباعیات شائع ہوا تھا۔

محشر میں روبرو مرے آ کے کھڑا ہوا
جانا کہ اس سے شور مچایا نہ جائے گا
غم بے ستوں نہیں ہے کہ آگے ہٹا دوں
سینے کا سنگ ہے یہ ہٹایا نہ جائے گا

حال دل شیدا تو چھپائے نہ بنے
سن کر اسے بن میرے ستائے نہ بنے
کہنا بھی نہ کہنا بھی ہیں دونوں آفت
اب بات کوئی موت بن آئے نہ بنے

(تلامذہ غالب مالک رام)

مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ

یہاں تاباںؔ کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتی ہوں۔ ان کا ذکر "تلامذہ غالب" میں نہیں ہے۔ یہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر رخشاں کے پوتے اور نواب شہاب الدین خاں ثاقبؔ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ تاباںؔ نے شعر و ادب کا ذوق میراث میں پایا تھا۔ ان کے دو ہی محبوب مشاغل تھے۔ شعر کہنا یا شطرنج کھیلنا۔ ان کے دوستوں میں حکیم اجمل خاں، حکیم عبد الحمید خاں، نواب فیض احمد خاں، پنڈت امرناتھ ساحرؔ شامل تھے۔ تاباںؔ بہت زندہ دل انسان تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ ہر وقت ان کے دیوان خانے میں دوست احباب آتے جاتے رہتے تھے۔ مزاج میں اس قدر سادگی تھی کہ امراء و رؤسا سے لے کر معمولی آدمی تک سے یکساں برتاؤ کرتے تھے۔ اس لیے سارا شہر ان کو استاد کہتا اور احترام کرتا تھا

شہر میں کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا تو اس میں تاباںؔ اور سائلؔ دونوں بھائی جاتے۔ سائلؔ کا کلام ایک تو رچا ہوا دوسرے دلپذیر ترنم اور بانکی سج دھج سے اس طرح پڑھتے تھے کہ واہ واہ کے شور سے مشاعرہ گونج جاتا۔ چھوٹے بھائی کی کامیابی پر ہنس کر اکثر کہتے۔ "یہ سائلؔ بالکل داغی بن گیا ہے۔ جب ہی بازاری انداز کے شعر کہتا ہے اور ترنم سے گاتا ہے۔ میں بھلا کیسے یہ بھانڈ پنا کر سکتا ہوں۔ میں نے غالبؔ و نیّرؔ کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان کے رنگ میں شعر کہتا ہوں"۔[1]

تاباںؔ نے غالبؔ کی زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔

اس کی شانِ گوناگوں ہم پر نمایاں ہو گئیں
کیسی کیسی صورتیں پیدا و پنہاں ہو گئیں
اس کے پرتو سے ہے ان میں جلوہ ہائے رنگ رنگ
میری آنکھیں روشن رخسارِ جاناں ہو گئیں

---

[1] خاندانِ لوہارو کے شعراء حمیدہ سلطان احمد ص ۳۳

غالب کے شاگردوں کا وسیع حلقہ ہے یہ ایک ایسا چمنستانِ سخن ہے جس میں ہر رنگ کا پھول موجود ہے۔ یہ ایک ایسا نگارخانہ ہے جس کی طلسم آرائی ہر نگاہ کو ایک زاویۂ نظر عطا کرتی ہے۔

عہدِ حاضر کے متعدد صاحبِ طرز ادیبوں اور انشاء پردازوں کے اسلوب کی توانائی یہی ہے کہ انھوں نے غالب سے استفادہ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب طرزِ احساس اور پیرایۂ اظہار دونوں اعتبار سے آج کے ذہن کے لیے سب سے زیادہ اپنے اندر کشش رکھتے ہیں۔ دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ موجودہ صدی میں اُردو کے ادیبوں اور شاعروں نے اپنی کتابوں کے لیے مناسب نام رکھنے کے لئے سب سے زیادہ غالب کی طرف رجوع کیا ہے۔ یہی غالب کی عظمت ہے کہ جہاں تک نظر جاتی ہے وہ شریکِ زندگی نظر آتے ہیں۔

کتابیات

۱۔ تلامذۂ غالب — مالک رام

۲۔ علی گڑھ میگزین — بشیر بدر (ایڈیٹر)

۳۔ ہریانہ کے ادیبوں کا حصّہ — کشمیری لال ذاکر، شمس تبریزی (مرتبین)

۴۔ تذکرہ شعراء ہریانہ — رانا گنوری

۵۔ خاندانِ لوہارو کے شعراء — حمیدہ سلطان احمد

۶۔ غالب کے خطوط — ڈاکٹر خلیق انجم

۷۔ غالب نامہ — پروفیسر نذیر احمد (مدیرِ اعلیٰ)

۸۔ جواہرِ آئینہ — طالب کاشمیری

حرفِ آخر

غالبؔ کی دوسو سالہ تقریبات کے سلسلہ میں اپریل ۱۹۹۸ء میں ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے ایک عظیم الشان سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا جس میں قومی وبین الاقوامی قلمکاروں نے شرکت کی تھی۔ اس موقع پر غالب کی شخصیت کے جو بہت سے پہلو سامنے آئے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ غالبؔ کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی تھی، جو نواب فیروز پور جھرکہ نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی تھے۔ اس لئے غالب کو مذکورہ رشتہ کی وجہ سے فیروز پور جھرکہ اور لوہارو سے ایک عرصہ تک پنشن بھی ملتی رہی۔ اس کے علاوہ غالبؔ کے بہت سے شاگردوں کا تعلق سرزمین ہریانہ سے بھی تھا۔ یہ وہ حقائق ہیں جو اس ریاست سے اُن کے تعلق اور رشتہ کو مستحکم بناتے ہیں۔ اسی کے پیش نظر "غالب اور سرزمین ہریانہ" عنوان کے تحت ایک پروجکٹ تیار کیا گیا جو اب کتابی صورت میں مکمل ہو کر آپ کے سامنے ہے۔

"غالب اور سرزمین ہریانہ" پروجکٹ کے تحت تیار کی گئی اس کتاب کا آغاز عزت مآب مہابیر پرساد جی کے "اظہارِ تہنیت" سے ہوتا ہے جس میں گورنر موصوف نے غالبؔ کی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ہریانہ اُردو اکادمی کی جانب سے اس دستاویزی کتاب کی اشاعت پر خوشی کا اظہار بھی کیا ہے۔ تہنیتی اظہار کے کے بعد عالی جناب اوم پرکاش چوٹالہ وزیرِ اعلیٰ ہریانہ اور صدر ہریانہ اُردو اکادمی نے اپنے "دُعائیہ" میں یقین ظاہر کیا ہے کہ اُردو دُنیا میں اکادمی کی اس کوشش کو

قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جناب وشنو بھگوان (آئی۔ اے۔ ایس) پرنسپل سکریٹری وزیراعلا ہریانہ اور جناب پریم پرشانت (آئی۔ اے۔ ایس) کمشنر مالیات و سکریٹری تعلیمات ہریانہ اور نائب صدر ہریانہ اُردو اکادمی نے بھی "حرف چند" اور "ابتدائیہ" عنوانات کے تحت گرانقدر کلمات میں نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے۔ اور غالب کی عظمت کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان حقائق کو پیش کرنے کی مساعی جمیلہ کی گئی ہے۔ جن کی روشنی میں زیر نظر کتاب کامیابی سے پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے۔

کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے۔ جس میں غالب اور ہریانہ کے رشتہ کو تحقیق کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ ان مقالات کے مطالعہ سے قارئین کے سامنے ایسے حقائق آئیں گے۔ جن سے وہ ابھی ناواقف تھے۔ کتاب کا پہلا مقالہ "ہریانہ کی تاریخ و تہذیب" جناب شہزاد علی نے قلم بند کیا ہے۔ جس میں انہوں نے ریاست کی جغرافیائی خاکہ نگاری کے بعد یہاں کی تاریخ و تہذیب کا جائزہ لیا ہے اور مختلف اقوام کا اس سرزمین سے جو تعلق رہا ہے اسے بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس مقالہ میں ہریانہ کے تعلیمی و سیاسی منظر نامہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور اس حقیقت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کوئی بھی دور رہا ہو اس سرزمین نے تاریخی، تہذیبی، ادبی اور ثقافتی لحاظ سے ہر طرح ہندوستان کی تاریخ و تہذیب کو متاثر کیا ہے۔

دوسرا مقالہ "اُردو اور ہریانوی کا باہمی رشتہ" ڈاکٹر راجندر سروپ وتس نے تحریر کیا ہے جو اُردو زبان کی نشو ونما کے تعلق سے مختلف ماہرین لسانیات کی آراء کی روشنی میں اس زبان کا ہریانوی سے باہمی رشتہ استوار کرنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ وہ اس خیال کی بھی وضاحت کرتے ہیں کہ اُردو اور ہندی کا جنم ہریانوی سے ہوا ہے۔ اس مقالہ میں ان عوامی شعراء اور ڈرامہ نگاروں کا بھی ذکر ہے۔ جنہوں نے اُردو اور ہریانوی زبان کے باہمی رشتے

کو تقویت پہونچائی اور جن کی کوششوں سے بے شمار اردو الفاظ نہایت دلکش انداز سے ہریانوی زبان میں رچ بس گئے۔

تیسرا مقالہ جناب کمال احمد صدیقی کا ہے جس کا عنوان "غالب کے اجداد" ہے۔ اور اس مقالہ کا آغاز غالب اور خواجہ الطاف حسین حالی کے اُستادی شاگردی کے رشتہ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مقالہ میں خطوطِ غالب کے مجموعوں کا ذکر ہے۔ اپنے وسیع مطالعہ کی بنیاد پر فاضل مقالہ نگار نے غالب اور ان کے اجداد کی زندگی کے حالات و واقعات مقالہ میں پیش کئے ہیں۔ جن کا سلسلہ افراسیاب سے ملتا ہے۔

چوتھا مقالہ "غالب اور نوابان لوہارو" ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے قلم بند کیا ہے اور نوابان لوہارو کو غالب کے قریب ترین رشتہ دار بتایا ہے۔ غالب کے چچا نواب نصر اللہ بیگ خاں نواب احمد بخش خاں کے بہنوئی تھے اور غالب کی شادی بھی احمد بخش خاں کی بھتیجی سے ہوئی تھی۔ اُن کے والد مرزا عبداللہ بیگ کی موت الور کے راجہ کے خلاف بغاوت کو ختم کرنے کی مہم میں ہوئی اور مہاراجہ نے پسماندگان کی پرورش کے لئے ایک گاؤں "پالکڑا" سونپا تھا۔ غالب کو ریاست فیروزپور جھرکہ سے پنشن بھی ملتی رہی۔ اس مقالہ کا حاصل یہ ہے کہ گو غالب کی خاندانی پنشن سے متعلق مقدمہ کی پیچیدگیاں اس خاندان سے رہیں۔ لیکن ان کی زندگی کے خوشگوار پہلو بھی اسی خاندان کے افراد سے جُڑے ہوئے ہیں۔

پانچواں مقالہ "خاندان لوہارو اور ریاست فیروزپور جھرکہ" عنوان کے تحت ڈاکٹر محمد ایوب خاں نے لکھا ہے جس میں سرزمین ہند پر خاندان لوہارو کی ابتدا سے ابتک کی تاریخ کو قلم بند کیا گیا ہے۔ اور ان حالات و واقعات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق بالخصوص غالب سے رہا ہے۔

چھٹا مقالہ "مرزا غالب کی پنشن کا مقدمہ" پروفیسر نثار احمد فاروقی نے تحریر کیا ہے۔ بلاشبہ غالب کی پنشن کا مقدمہ ان کی زندگی کا اہم ترین اور پیچیدہ

مسئلہ تھا جس نے اُن کی پوری زندگی اور فکر کو گہرائی سے متاثر کیا۔ فاضل مقالہ نگار نے اس مقالہ میں ان تمام حقائق سے پردہ اٹھانے کی سعی کی ہے کہ یہ پنشن کیوں تھی؟ اور کس لئے تھی؟ نیز یہ تنازعہ کیوں پیدا ہوا؟ اِن تمام سوالات کو بہت ہی سُلجھے ہوئے ذہن سے اس مقالہ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہ دعویٰ تھا جس کی غرض ہر طرف سے مایوس ہوکر گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کی عدالت میں غالب نے ۲۸ فروری ۱۸۲۸ء کو داخل کی تھی جس کا خلاصہ اس مقالہ میں شامل ہے۔ مقدمہ بازی کی بدولت غالب تو اپنی زندگی جیسے بھی گذری گذار گئے مگر اُن کے طفیل ہزار رنجشوں کے باوجود احمد بخش خاں مرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔

ساتواں مقالہ بعنوان "مرزا غالب کی پنشن کا قضیہ اور دیگر امور۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے حوالے سے" میں جناب مخمور سعیدی نے ان تمام امور کو پیش کیا ہے جن کی بدولت نصر اللہ بیگ خاں کی جاگیر کے عوض انگریزی سرکار نے ان کے لواحقین کی پنشن مقرر کی جبکہ مقالہ کا آغاز غالب کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات سے کیا گیا ہے جو الور کے راجہ بختاور سنگھ کی حمایت میں لڑتے ہوئے گولی کا نشانہ بنے اور اس کے عوض ان کی اولاد کو ملنے والی دو گاؤں کی آمدن اور کچھ روزینہ کا ذکر مقالہ نگار نے "یادگارِ غالب" کے حوالے سے کیا ہے۔ اس مقالہ میں پنشن کے قضیہ کے ساتھ ساتھ وہ تمام تاریخی حقائق بھی پیش کئے گئے ہیں جو اس دوران رونما ہوئے۔

آٹھواں مقالہ جناب شاہد ماہلی نے تحریر کیا ہے جس کا عنوان "غالب اور ان کے چند معاصرین" ہے جس کی شروعات دہلی کے اجڑنے کے بعد دوبارہ آباد ہونے سے کی گئی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب شاہ نصیر، شیخ ابراہیم ذوق، مرزا اسد اللہ خاں غالب، بہادر شاہ ظفر، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، جعفر علی خاں زکی، نواب میر تھے۔ دہلوی مضامین و موضوعات اپنانے والوں میں غالب سرِ فہرست تھے۔ ان کی ذوق سے چشمک بھی رہتی تھی۔ اس مقالہ میں غالب کے معاصر امام بخش صہبائی کا بھی ذکر ہے جو فارسی کے زبردست شاعر تھے۔

نواں مقالہ "غالب اور قتیل" کے عنوان سے ڈاکٹر خلیق انجم نے تحریر کیا ہے۔ جس میں فاضل مقالہ نگار نے غالب کو نہ صرف انیسویں صدی بلکہ آنے والے زمانے کا بھی عظیم شاعر تسلیم کیا ہے اور اپنے عہد کے ہندوستان کی تمام زبانوں کا سب سے بلند اور ممتاز شاعر قرار دیا ہے۔ اس تحقیق اور تجزیہ سے بہت سے نئے پہلو قاری کے سامنے آتے ہیں اور کلکتہ کے ان تمام ادبی معرکوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے جن کا تعلق غالب سے ہے اور آخر میں غالب کی قتیل سے بے بنیاد نفرت کی وجہ بھی سامنے آتی ہے۔

اس کتاب کا آخری مقالہ "مرزا غالب کے ہریانوی شاگرد اور خاندان لوہارو کے شاعر" ڈاکٹر فرزانہ نسیم نے سپردِ قلم کیا ہے۔ جس میں غالب کی شخصیت کے مقابل ان کی شاعرانہ عظمت کو پیش کیا گیا ہے۔ جس بنا پر ان کے مقلدین میں زیادہ تر صاحبِ طرز شاعر پیدا ہوئے اور ان کے بہت سے شاگردوں کا تعلق سرزمین ہریانہ سے تھا۔ مقالہ کا اختتام اس سچائی سے کیا گیا ہے کہ آج کے شعرا بھی غالب کی فکر سے خود کو بچا نہیں سکے اور یہی غالب کی عظمت ہے۔

الغرض غالب اور ہریانہ کے تعلق سے اب تک جو دروازے بند تھے وہ اس کتاب کی اشاعت سے وا ہوں گے اور تحقیق کی نئی راہیں منور ہوں گی جو غالب شناسی میں ممد و معاون ثابت ہوں گی۔

کشمیری لال ذاکر